جلد ۸۱ مارچ، اپریل ۱۹۹۷ء شمارہ ۔ ۳، ۴

اس شمارے میں

- مختصر حالات زندگی: مجدد اعظم ۔۔ (۲) ۱
  حفیظ الرحمٰن شیخ
- اسلام میں ریاست کا تصور ۔۔ (۲) ۴
  حضرت مولانا محمد علی، مفسر قرآن
- معراج النبی صلعم کی اہمیت ۔۔ ۸
  ناصر احمد
- بے نظیر روحانی انوار کا الٰہی سرچشمہ ۔۔ ۵ ۱۶
  شیخ غلام ربانی
- ایک اقتباس: علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور لاہوری جماعت ۲۰
- کتاب کا تعارف: حقیقت معجزات از ڈاکٹر قمرالزمان ۔ (۲) ۲۲

مختصر حالات زندگی

مجدد اعظم - ۲

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی، بانی سلسلہ احمدیہ

تلخیص و ترتیب: حفیظ الرحمن شیخ

شادی

آپ انیس سال کی عمر کو پہنچے تو آپ کے والد ماجد نے آپ کی شادی آپ کے ماموں مرزا حمیت بیگ کی بیٹی سے کر دی۔ یہ شادی خاندانی روایات اور رسم و رواج کے بالکل برعکس نہایت سادہ طریقے سے ہوئی۔ آپ اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ نہایت نیک سلوک کرتے اور حسن معاشرت سے پیش آتے تھے۔ عین عنفوان شباب میں نئی شادی اکثر اپنی طرف جاذب ہوا کرتی ہے مگر آپ کے لئے جناب الٰہی کی طرف اس قدر جذب تھا کہ اس شادی سے آپ کی خلوت پسندی اور عبادت الٰہی میں استغراق میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ آپ حسب معمول مسجد میں یا مسجد کے چھوٹے سے حجرے میں عبادت اور یاد الٰہی میں مصروف و مشغول رہا کرتے حتیٰ کہ بعض اوقات بی بی صاحبہ آپ کا کھانا آپ کے حجرے میں بھجوا دیا کرتی تھیں۔

غذا

آپ کی غذا بڑی سادہ ہوتی تھی۔ بہت کم کھانا تناول فرماتے تھے جو کھانا گھر سے آتا تھا اس میں سے زیادہ تر بچوں میں تقسیم فرما دیتے اور جو بچ جاتا خود کھایا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو صرف شوربہ پینے پر ہی اکتفا کیا کرتے تھے۔ اس طرح کے مجاہدات سے آپ نے اپنے نفس کو ایسا پایا کہ بوقت ضرورت آپ فاقہ کشی پر زیادہ سے زیادہ صبر کر سکتے تھے۔

عبادت

آپ کو چونکہ قرآن مجید اور سنت نبویؐ سے والہانہ عشق تھا اس لئے آپ کی عبادات قرآن و سنت نبویؐ سے کبھی متجاوز نہ ہوتی تھیں۔ پانچ وقت کی نماز کے علاوہ تہجد کی نماز کا بہت التزام تھا۔ اشراق کی نماز بھی پڑھتے تھے مگر تہجد کی نماز سے بہت محبت تھی۔ آپ اس قدر انہماک سے نماز پڑھتے کہ گویا آپ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ نماز تہجد میں سورۂ فاتحہ کو بہت درد اور توجہ سے پڑھتے تھے اور بہت دعائیں کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے کہ جس طرح نشے اور سرور کے لئے شرابی بار بار شراب کے پیگ پیتا ہے میں نے سوچا کہ میں بھی بار بار نماز پڑھوں تاکہ روحانی نشہ اور سرور حاصل ہو جائے یعنی حضوری قلب حاصل ہو جائے۔ نماز کے علاوہ آپ کا وظیفہ قرآن شریف کی تلاوت، درود شریف کا ورد اور استغفار ہوتا تھا۔ درود شریف سمجھ کر پڑھتے اور کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی تلاوت میں تو ہر وقت اٹھتے بیٹھتے ٹہلتے مشغول رہتے اور زار زار رویا کرتے تاہم آپ نے کبھی ریاضات شاقہ نہیں کیں اور نہ زمانہ حال کے بعض صوفیوں کی طرح چلہ کشیوں اور مجاہدات شدیدہ میں اپنے نفس کو ڈالا اور نہ ہی گوشہ گزینی کی۔ کوئی ایسا عمل رہبانیت نہیں کیا جو خلاف سنت نبویؐ ہو اور جس پر اللہ تعالیٰ کو اعتراض ہو۔ آپ عبادت و ریاضت کے ایسے طریقوں کو جو قرآن و سنت سے متجاوز ہوں بدعت سمجھتے تھے بلکہ انہیں نئی شریعت سے تعبیر کرتے تھے۔

خلوت نشینی

آپ چونکہ دن رات مطالعہ میں مستغرق اور مسجد میں عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے اس لئے آپ کے والد ماجد کہا کرتے تھے کہ --- "ہمارے گھر میں یہ ملاں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے" --- کوئی

حضرت مرزا غلام احمد سے ملنے آتا تو اسے بتایا کرتے کہ --- "مسجد میں جا کر سقاوہ کی کسی ٹوٹنی کے سامنے دیکھو اگر وہاں نہ پاؤ تو مسجد کے کسی گوشے میں تلاش کرو۔ اگر وہاں بھی نہ ملے تو کسی لپٹی ہوئی صف میں دیکھنا کہ کوئی اس میں لپیٹ کر نہ چلا گیا ہو کیونکہ وہ تو زندگی میں ہی مرا ہوا ہے" --- اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ موتوا قبل ان تموتوا یعنی مرنے سے پہلے مرجاؤ کے مصداق بن چکے تھے۔

دنیاداری سے نفرت

حضرت مرزا غلام احمد کو زمینداری اور اس کے متعلقہ مقدمات سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ اس قسم کی دنیاداری کی باتوں سے آپ کو سخت نفرت تھی وہ انہیں اپنے محبوب مشاغل عبادت اور ذکر الٰہی وغیرہ میں حارج سمجھتے تھے۔ والد ماجد کے حکم پر آپ کچھ عرصہ تک مقدمات کی پیروی اور زمینداری کے امور کی نگرانی میں لگ گئے مگر جلد ہی آپ کو احساس ہوا کہ اس طرح آپ کا بہت سا وقت عزیز دنیاداری میں ضائع ہو جائے گا۔ آپ اس طبیعت اور فطرت کے آدمی نہیں تھے اس لئے آپ کو اکثر اپنے والد صاحب کی ناراضگی کا نشانہ بننا پڑتا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ دنیاداروں کی طرح ان کا بیٹا بھی روبہ خلق بن جائے مگر زمینداری کے کاموں میں مصروف ہونے کی بجائے حضرت مرزا غلام احمد صاحب اکثر حصہ وقت قرآن مجید کے تدبر اور تفسیروں اور احادیث نبویؐ کے مطالعے میں صرف کر دیتے وہ بسااوقات یہ کتابیں اپنے والد کو بھی پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اپنی طبیعت میں دنیاداری سے بیزاری کے باوجود آپ اپنے والد بزرگوار کے حکم کی تعمیل میں مقدمات وغیرہ کی پیروی کرنے چلے جاتے مگران کی پیروی کے دوران آپ نے ہمیشہ راستبازی سے کام لیا حالانکہ آپ کو اپنے اس رویے کے باعث متعدد مقدمات میں کافی نقصانات اٹھانا پڑے۔

ملازمت

آپ کے والد صاحب نے جب دیکھا کہ زمینداری اور اس کے لوازمات مقدمات میں آپ کا جی نہیں لگتا تو آپ کو ملازم کرانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار ریاست جموں و کشمیر میں ایک معزز عہدے پر فائز رہ چکے تھے جس کی وجہ سے ریاست پر آپ کے حقوق تھے۔ ایک برادر زادہ کی تحریک پر آپ نے حضرت مرزا غلام احمد کو جموں جانے کا حکم دیا۔ آپ وہاں چلے تو گئے مگر ریاستوں کی نوکریوں میں درباداری اور خوشامد کا رنگ بہت غالب ہوتا تھا اور ان باتوں سے آپ کو سخت نفرت تھی اس لئے وہاں ملازمت کرنے کو دل نہ چاہا۔ جتنے دن وہاں رہے سوائے نماز ادا کرنے اور قرآن مجید کی تلاوت میں وقت گذارنے کے اور کچھ نہ کیا۔ جب آپ کے والد کو یہ پتہ چلا تو چند روز کے بعد ایک رشتہ دار کو جموں بھیج کر حضرت مرزا صاحب کو واپس بلوا لیا اور کوشش کر کے ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر میں اہلمد متفرقات کی آسامی پر ملازم کرا دیا جہاں آپ چار برس رہے۔ یہ ۱۸۶۴ء سے لے کر ۱۸۶۸ء کا زمانہ تھا۔ اس دوران آپ اللہ تعالیٰ' افسران بالا اور دیگر مخلوق کے حقوق و فرائض کو نہایت احسن طریقے سے ادا کرتے رہے۔ اپنی راستبازی' دیانت و امانت داری' تقویٰ و طہارت اور نیک روش کے باعث آپ نے دوست دشمن سبھی سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس کا ثبوت مصور پاکستان علامہ محمد اقبال کے استاد شمس العلماء سید میر حسن شاہ مرحوم' جو اس زمانے کے فارسی و عربی کے مشہور و معروف استاد اور بہت بڑے عالم و فاضل اجل تھے' کے ایک خط سے ملتا ہے جس میں انہوں نے (مولانا سید میر حسن شاہ صاحب نے) یہ تحریر کیا تھا:

"مرزا غلام احمد صاحب ۱۸۶۴ء میں بتقریب ملازمت شہر سیالکوٹ میں تشریف لائے اور قیام فرمایا۔ آپ چونکہ عزلت پسند اور پارسا اور فضول اور لغو سے مجتنب اور محترز تھے اس لئے عام لوگوں کی ملاقات' جو اکثر تضیع اوقات کا باعث ہوتی ہے آپ پسند نہیں فرماتے تھے۔ لالہ بھیم سین وکیل جن کے نانا ڈپٹی متھن لعل صاحب بٹالہ میں اکسٹرا اسسٹنٹ تھے ان کے بڑے رفیق تھے اور چونکہ بٹالہ میں میرزا صاحب اور لالہ صاحب آپس میں تعارف رکھتے تھے اس لئے سیالکوٹ میں بھی ان سے کامل اتحاد رہا۔ پس سب سے کامل دوست اگر اس شہر میں تھے تو وہ لالہ صاحب ہی تھے اور چونکہ لالہ طبع سلیم اور لیاقت زبان فارسی اور ذہن رسا رکھتے تھے اس سبب سے بھی مرزا صاحب کو

علم دوست ہونے کے باعث ان سے بہت محبت تھی۔ مرزا صاحب کی علمی لیاقت سے کچہری والے آگاہ نہ تھے مگر چونکہ اسی سال کے اوائل گرما میں ایک عرب نوجوان محمد صالح نام شہر میں وارد ہوئے اور ان پر جاسوسی کا شبہہ ہوا تو ڈپٹی کمشنر صاحب نے (جن کا نام پر کنسن تھا اور پھر وہ آخر میں کمشنر راولپنڈی کمشنری کے ہو گئے تھے) محمد صالح کو اپنے محکمہ میں بغرض تفتیش طلب کیا۔ ترجمان کی ضرورت تھی مرزا صاحب چونکہ عربی میں استعداد رکھتے تھے اور عربی زبان میں تحریر و تقریر بخوبی کر سکتے تھے اس واسطے مرزا صاحب کو بلا کر حکم دیا کہ جو جو بات ہم کہیں عرب صاحب سے پوچھو اور جو جواب وہ دیں اردو میں ہمیں لکھواتے جاؤ۔ مرزا صاحب نے اس کام کو کماحقہ ادا کیا تب آپ کی لیاقت لوگوں پر منکشف ہوئی۔"

مرزا صاحب پادریوں کے ساتھ مباحثہ کو بہت پسند کرتے تھے اس واسطے مرزا شکستہ تخلص نے جو بعد ازاں موحد تخلص کیا کرتے تھے اور مراد بیگ نام جالندھر کے رہنے والے تھے مرزا صاحب کو کہا کہ سید احمد خان نے تورات اور انجیل کی تفسیر لکھی ہے آپ ان سے خط و کتابت کریں۔ اس معاملہ میں آپ کو بہت مدد ملے گی چنانچہ مرزا صاحب نے سر سید کو عربی میں خط لکھا۔

ان دنوں پنجاب یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی اور اس میں عربی استاد کی ضرورت تھی جس کی تنخواہ ایک سو روپے ماہوار تھی میں نے (یعنی مولانا سید میر حسنؒ صاحب نے) عرض کی آپ درخواست بھیج دیں چونکہ آپ کی لیاقت عربی زبان دانی کی نہایت کامل ہے آپ ضرور اس عہدہ پر مقرر ہو جائیں گے۔ فرمایا --- "میں مدرسی پسند نہیں کرتا کیونکہ پڑھ کر بعد ازاں بہت شرارت سے کام کرتے ہیں اور علم کو ذریعہ اور آلہ ناجائز کاموں کا بنا لیتے ہیں۔ اس آیت کے وعید سے بہت ڈرتا ہوں --- احشر واللذین ظلموا ازواجھم --- اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے نیک باطن تھے۔

اسی سال سر سید احمد خان صاحب غفرلہ نے قرآن شریف کی تفسیر شروع کی تھی تین رکوع کی تفسیر یہاں میرے پاس آ چکی تھی جب میں اور شیخ اللہ داد صاحب، مرزا صاحب کی ملاقات کے لئے لالہ بھیم سین صاحب کے مکان پر گئے تو اثناء گفتگو سر سید احمد خان صاحب کا ذکر شروع ہوا۔ اتنے میں تفسیر کا ذکر بھی آ گیا راقم نے کہا تین رکوعوں کی تفسیر آ گئی ہے جس میں دعا اور نزول وحی کی بحث آ گئی ہے۔ فرمایا --- "کل جب آپ آویں تو تفسیر لیتے آویں" --- جب دوسرے دن وہاں گئے تو تفسیر کے دونوں مقام آپ نے سنے اور سن کر خوش نہ ہوئے اور تفسیر کو پسند نہ کیا۔

اس زمانہ میں مرزا صاحب کی عمر راقم کے قیاس میں تخمیناً ۲۴ سے کم اور ۲۸ سے زیادہ نہ تھی غرضیکہ ۱۸۶۴ء میں آپ کی عمر ۲۸ سے تجاوز نہ تھی" (راقم میر حسن) (یہ خط شیخ یعقوب علی تراب صاحب ایڈیٹر "الحکم" نے شائع کیا تھا)

اسی طرح ایک اور خط میں جسے "الحکم" میں شیخ یعقوب علی تراب نے شائع کیا تھا مولوی سید میر حسن شاہ صاحب نے مرزا صاحب کے بارے میں تحریر کیا تھا:

"حضرت مرزا صاحب پہلے محلہ کشمیریاں میں جو اس عاصی پر معاصی کے غریب خانہ کے بہت قریب ہے عمرا نامی کشمیری کے مکان پر کرایہ پر رہا کرتے تھے۔ کچہری سے جب تشریف لاتے تھے تو قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف ہو جاتے تھے۔ بیٹھ کر کھڑے ہو کر ٹہلتے ہوئے تلاوت کرتے تھے اور زار زار رویا کرتے تھے۔ ایسی خشوع اور خضوع سے تلاوت کرتے تھے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی"۔ (راقم میر حسن)

حضرت مرزا احب کے قیام سیالکوٹ کے بارے میں بانی اخبار "زمیندار" مولوی سراج الدین احمد صاحب (مولانا ظفر علی خان کے والد) نے اپنے اخبار میں ایک مرتبہ تحریر کیا کہ:

"مرزا غلام احمد صاحب ۱۸۶۰ء یا ۱۸۶۱ء کے قریب ضلع سیالکوٹ میں محرر تھے اس وقت آپ کی عمر ۲۲، ۲۴ سال کی ہو گی اور ہم چشم دید شہادت سے کہہ سکتے ہیں کہ جوانی میں بھی نہایت صالح اور متقی تھے۔ کاروبار ملازمت کے بعد ان کا تمام وقت مطالعہ دینیات میں صرف ہوتا تھا۔ عوام سے کم ملتے تھے"۔ (ختم شد)

(سن کے متعلق سراج الدین احمد صاحب کی یادداشت نے غلطی کی ہے حضرت مرزا صاحب ۱۸۶۴ء میں سیالکوٹ تشریف لے گئے تھے)

انگریزی سے ترجمہ

اسلام میں ریاست کا تصور - ۲

کاوش: کیپٹن عبدالسلام خاں

خدا اور عوام کے سامنے جوابدہ ہونے کا عملی نمونہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب، مفسر قرآن

محولہ بالا آیات و احادیث بتلاتی ہیں کہ موروثی بادشاہت ایک ریاست کے اسلامی تصور کے لئے ایک بیگانہ تصور ہے اور نہ ہی ایک اسلامی ریاست ایک شخصی آمریت ہوتی ہے کیونکہ سربراہ ریاست کے اختیارات لامحدود نہیں ہوتے۔ یہ تو پہلے ہی اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ قانون سب کے لئے ایک ہوتا تھا اور ہر کوئی بشمولیت سب سے اعلیٰ کمان کے حامل شخص کے اور بشمولیت خود حضور نبی صلعم کے اتنے ہی قانون کی عملداری کے تحت تھے جتنا کہ ان کے پیروؤں میں کوئی بھی اور شخص۔ مسلمانوں کی نمایاں خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم ایک اتنی ہی اہم خوبی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے: "اور ان کے امور باہم مشاورت سے طے ہوتے ہیں" (۴۲:۳۸)۔ جس سورہ میں یہ آیت پائی جاتی ہے اس کو "شوریٰ" کا نام دیا گیا ہے بوجہ اس بات کے کہ اس سورہ میں مشاورت کے عظیم جمہوری اصول کو بطور آئندہ اسلامی ریاست کی بنیاد کے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ابتدائی وحیوں میں سے ایک ہے جس وقت کہ نبی کریم صلعم ایک بے یار و مددگار اور ستم زدہ مصلح کی زندگی بسر کر رہے تھے اور یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ کس طرح دو ذہنی خاکے، اسلامی ریاست کو جمہوریت اور روحانیت کا رنگ دینے کے خاکے، آپس میں آمیزہ کر دیئے گئے ہیں۔ "اور جو لوگ اپنے رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ان کا کام آپس میں مشورہ سے طے ہوتا ہے اور اس سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں" (۴۲:۳۸-۴۲)

"میں تو کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں" (۱۰:۱۵)۔

اس آیت میں حسب معمول مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ نماز کو قائم کریں اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کریں مگر ان دو احکامات کے درمیان میں دو احکامات جو قرآن کریم میں ہمیشہ اکٹھے پائے جاتے ہیں اور جو ایک سچی اسلامی زندگی کی بنیاد ہیں۔ ایک تیسرا حکم رکھ دیا گیا ہے--- "اور ان کا کام آپس میں مشورہ سے طے ہوتا ہے"۔ اتنے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کو یہ حکم دینے کا صاف مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو تاریخ ساز ریاستی امور کو نمٹانے کے لئے تیار کیا جائے اور تمام قومی مسائل کو حل کرنے کے لئے بھی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ لفظ "امر" جس کا ترجمہ "کام" کیا گیا ہے کے معنوی معنی حکم کے ہیں اور امراللہ یعنی اللہ کی کمانڈ کا اکثر مفہوم زمین پر خدا کی بادشاہی قائم کرنے کا ہوتا ہے جو کہ ایک اسلامی ریاست کے مترادف اصطلاح ہے۔ اس لئے لفظ امر کا یہاں استعمال اسلامی ریاست کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے امور مشاورت کے ذریعہ طے ہوں گے۔ یہ آیت ان عظیم اعمال کو اجاگر کرتی ہے جو کہ انسان کو روحانی سطح پر پہنچانے کے لئے درکار ہیں یعنی خدا کی دعوت کا جواب دینا، خدا سے دعا کرنا اور بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا۔ اور ساتھ ہی یہ آیت امور ریاست کے چلانے کا اصول بھی بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد کی آیات بھی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ حضور صلعم اپنے پیروؤں کو امور سلطنت کے چلانے کی تربیت کے دوران چاہتے تھے کہ ان کی روحانی خطوط پر تربیت کی جائے۔

"اور وہ--- کہ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ پھر جو کوئی معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا اور جو کوئی

اپنے (اوپر) ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر (الزام) کا راستہ نہیں۔ (الزام کا) راستہ صرف ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔ انہی کے لئے دردناک دکھ ہے اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کرے تو یہ بڑی اہمیت کے کاموں میں سے ہے" (۴۳:۴۲-۴۳)۔ مسلم قوم کے دفاع کے لئے یہ بہترین قوانین جنہیں اس وقت دبایا اور ستایا جا رہا تھا اور وہ دشمن جو جنہیں مٹانے پر تلا ہوا تھا اس کو معاف کرنے کا ذکر صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہاں پر ایک مسلمان ریاست کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے کیونکہ معافی تو صرف ایک شکست خوردہ دشمن کو ہی دی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں کو ان کے مصائب اٹھانے کے دوران ہی بتایا جا رہا ہے کہ جب ایک شکست خوردہ دشمن سے انتقام لینے کی باری آئے تو وہ عفو سے کام لیں۔ پس اس طرح شروع سے ہی ان کے دلوں سے انتقام کے جذبہ کو مٹایا جا رہا تھا اور ریاست کی مادی طاقت کو اخلاقی لحاظات کا تابع بنا کر اس کو روحانی رنگ میں رنگا جا رہا تھا۔

ایک اسلامی ریاست جمہوریت کے صحیح ترین مفہوم کے مطابق جمہوری ہوتی ہے۔ نبی کریم صلعم کے پہلے جانشین حضرت ابوبکرؓ تھے اور اس طرح باقی تینوں جانشین بھی جو ان کے بعد ہوئے جو کہ تمام فریقوں کی رضامندی کے ساتھ سربراہ ریاست منتخب ہوئے تھے ریاست کی تنظیم کی کیوں ضرورت ہے اور سربراہ ریاست کی آئینی حیثیت کیا ہونی چاہئے یہ باتیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں بیان کر دیں۔

تم نے مجھے خلیفہ منتخب کیا ہے مگر میں تم پر کسی فضیلت کا دعوے دار نہیں ہوں۔ تم میں سے سب سے طاقتور میرے نزدیک سب سے کمزور ہو گا تاوقتیکہ کہ میں اس سے اوروں کے حقوق وصول نہ کر لوں اور تم میں سے سب سے کمزور میرے نزدیک سب سے طاقتور ہو گا تاوقتیکہ میں اسے اس کے تمام حقوق نہ دلوا دوں۔ اگر میں راستی پر چلوں تو میری مدد کرو اگر میں غلط راستہ اختیار کروں تو مجھے درست کرو! جب تک میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں میری اطاعت کرو! اگر میں خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کروں تو مجھے تم سے اطاعت کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں"۔

ریاست کا سربراہ ایک خادم ریاست تھا جسے بیت المال سے ایک مقررہ گذارہ الاؤنس یا تنخواہ ملتی تھی جیساکہ اور خادمین ریاست کو۔ یہ ابوبکرؓ تھے حضور صلعم کے پہلے جانشین جنہوں نے اس قاعدہ پر عمل کرنا شروع کیا (بخاری ۱۵:۳۴)۔ سربراہ کو کوئی خاص مراعات حاصل نہ تھیں اور اپنی ذاتی پوزیشن میں اس پر کورٹ میں دعویٰ کیا جا سکتا تھا جیساکہ دوسرے عام شہریوں پر۔ حضرت عمر فاروقؓ عظیم خلیفہ وقت' ایک جج کے کورٹ میں بطور مدعا علیہ کے حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے صوبائی گورنروں کو جو احکامات جاری کئے ان میں سے کچھ یہ تھے: انہیں دن کے تمام اوقات میں شکایت کنندگان کو ان سے ملنے کا موقعہ دینا چاہئے اور دروازے پر دربان نہیں رکھنا چاہئے جو کہ لوگوں کو ان تک رسائی سے روکے۔ علاوہ ازیں انہیں اپنے آپ کو ایک سخت زندگی گذارنے کا عادی بنانا چاہئے۔

سربراہ ریاست وزیروں کی مدد سے امور ریاست چلاتا تھا اور ہر اہم معاملہ کا ایک کونسل میں فیصلہ کیا جاتا تھا۔

عمال حکومت بشمولیت سربراہ سے تقاضا کیا جاتا تھا کہ وہ عوام کی بھلائی کے لئے کام کریں۔

"کوئی شخص ایسا نہیں کہ اللہ نے اسے لوگوں پر حکومت عطا کی ہو اور وہ ان کی بھلائی کے لئے امور کا انتظام نہیں کرتا' مگر وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔" (بخاری ۸:۹۴)۔

ان کا فرض تھا کہ وہ لوگوں سے نرمی برتیں اور ہر ایسے عمل سے گریز کریں جس سے لوگوں میں مخالفت پیدا ہو (بخاری ۶۲:۶۴)۔ انہیں سادہ زندگی بسر کرنے اور لوگوں کے لئے قابل رسائی ہونے کا حکم دیا گیا اور یہ کہ وہ خدا کا خوف کریں (بخاری ۱۶:۹۴)۔ لوگوں کے مختلف طبقات پر ان کی استطاعت کے مطابق ٹیکس لگائیں جو لوگ کما نہ سکیں ان کے لئے روزی مہیا کریں اور غیر مسلموں کے حقوق کے لئے بھی اتنا ہی پاس رکھیں جتنا کہ مسلمانوں کے لئے (بخاری ۸:۶۲)۔

عوام کی ریاست کے بارہ میں یہ ذمہ داری ہو گی کہ وہ اس کے قوانین کا احترام کریں اور اس کے احکامات کی اطاعت کریں بشرطیکہ ان

قوانین کی اطاعت سے خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی نہ ہوتی ہو۔ نبی کریم کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیعت کنندگان سے اپنے پہلے خطاب میں کہا: "اگر میں راستی پر ہوں تو میری مدد کرو۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کروں تو مجھے تم سے اطاعت کا تقاضا کرنے کا کوئی حق نہیں ہو گا"۔ قرآن کا قانون سب قانونوں سے اعلیٰ و برتر ہو گا اور حضور صلعم نے بذات خود قانون کی بالادستی کو رائج کیا:

"حکام کی بات سننا اور اطاعت کرنا لازمی ہے بشرطیکہ خدا کی نافرمانی کا حکم نہ دیا گیا ہو"۔

اگر کسی کو خدا کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو وہ نہ ہی سنے اور نہ ہی اطاعت کرے" (بخاری ۱۰۸:۵۶)[۵]۔

اس طرح گو ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا ایک جہاد سمجھا جاتا تھا۔ (مشکوۃ ۱:۱۷)۔ مگر آئینی طور پر مقرر کردہ حکام کی سرگرم مخالفت یا بغاوت کی اجازت نہ تھی کیونکہ نبی کریمؐ نے شرط عائد کی تھی کہ "سنو اور اطاعت کرو" چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں، چاہے ہم فراغت میں ہوں یا تنگی میں۔ چاہے ہمارے حقوق بھی ہمیں نہ دیئے گئے ہوں"۔ اور یہ کہ "سربراہ کی اتھارٹی کو صرف اس بناء پر متنازعہ بنایا جا سکتا تھا کہ وہ کھلم کھلا کفر بھرے اعمال کا مرتکب ہو رہا ہو جن کے بارہ میں اللہ کی طرف سے صاف صاف احکامات ہوں" (بخاری ۲:۹۳) گو کہ قرآن کا قانون واقعی سپریم تھا مگر لوگوں کی ضروریات کے مطابق قانون بنانے پر کوئی قدغن نہ تھی بشرطیکہ وہ الہامی قوانین کی روح کے خلاف نہ ہو۔ جب حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر بنایا گیا تو حضور صلعم نے ان سے پوچھا کہ وہ کس قاعدے پر عمل کریں گے۔ "میں قرآن کے قانون پر عمل پیرا ہوں گا" حضورؐ نے کہا "اگر تمہیں قرآن میں کسی معاملہ میں کوئی رہنمائی نہ ملے تو پھر؟" "تب میں نبیؐ کی سنت کے مطابق عمل کروں گا" معاذ نے کہا۔ "اگر تمہیں نبیؐ کی سنت سے راہنمائی نہ ملے تو پھر؟" ان سے پھر پوچھا گیا۔ "تب میں اپنی قوت فیصلہ و قیاس کو حرکت میں لاؤں گا اور اس کے مطابق عمل کروں گا" معاذ نے جواب دیا۔ نبی صلعم نے ہاتھ بلند کئے اور فرمایا "تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جو اس کے رسولؐ کے رسول کو ہدایت کرتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے۔ (بخاری ۱۱:۲۳)۔ تاہم ضروری قانون مشاورت کے ذریعہ بنائے جاتے تھے بمطابق حکم قرآنی کہ "اور جن کے معاملات آپس میں مشاورت کے ذریعہ (طے) ہوتے ہیں (۴۲:۳۸)۔ حضرت علیؓ کے اس سوال کے جواب میں کہ اگر کسی معاملہ کے بارہ میں قرآن میں کوئی خصوصی ہدایت نہ پائی جائے تو کیا کرنا چاہئے۔ روایت ہے کہ حضور نبی کریم نے فرمایا "میری کمیونٹی کے راستباز لوگوں کو اکٹھا کرو اور معاملہ کو ان کے مشوروں کے مطابق نمٹاؤ اور ایک آدمی کی رائے کے ذریعہ فیصلہ مت کرو"۔ حضور صلعم خود بھی اہم امور میں اکثر مشاورت کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔

مدینہ پر قریش مکہ نے تین بار حملہ کیا اور تینوں دفعہ حضور نبی صلعم نے اپنے پیروؤں کے ساتھ مشورہ کیا کہ دشمن کے خلاف کس طرح دفاع کیا جائے۔ ان موقعوں میں ایک موقعہ پر حضور صلعم نے اکثریت کی رائے پر عمل کیا اور دشمن کا مقابلہ مدینہ سے باہر نکل کر کیا۔ اگرچہ خود ان کی اپنی رائے تھی کہ مسلمانوں کو شہر نہیں چھوڑنا چاہئے۔ انہوںؐ نے اپنے پیروؤں کو قطعی ہدایت کی تھی کہ جب بھی کوئی اہم معاملے کا فیصلہ کرنا درپیش ہو تو وہ آپس میں مشورہ کریں۔ "لوگ کبھی بھی مشاورت نہیں کرتے مگر انہیں اپنے معاملہ میں صحیح راستہ کی طرف ہدایت مل جاتی ہے"۔ ایک دفعہ جب کچھ لوگوں نے ایک جنگ میں آپؐ کی حکم عدولی کی جس کی وجہ سے مسلمان فوج کو

۵۔ یہ اس قرآنی حکم کے مطابق ہے جس میں حکومت بذریعہ مشاورت کا اصول بیان کرنے کے فوراً بعد یہ کہا گیا ہے: "اے وہ جو ایمان لائے ہو! اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور اپنے میں سے صاحبان امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو۔ تو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لے جاؤ، اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان لاتے ہو یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے" (۴:۵۹)۔ یہ آیت مسلم کمیونٹی کی بھلائی کے لئے تین اہم قاعدے بالخصوص ریاستی معاملات کے حوالہ سے بتاتی ہے: اول، خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت، دوم، مسلم کمیونٹی میں سے صاحبان امر کی اطاعت اور صاحبان امر سے جھگڑے کی صورت میں امور کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹا دینا۔ اس طرح خدا اور اس کا رسولؐ فائنل اتھارٹی ہیں۔ الفاظ "صاحبان امر" کا مفہوم وسیع ہے۔ اس لئے مختلف انسانی زندگی سے متعلق معاملات میں مختلف لوگ صاحبان امر ہوں گے۔ مثلاً فوج کے ایک سیکشن کا کمانڈر صاحبان امر سے شامل سمجھا گیا (بخاری ۱۱:۶۵)۔

بھاری نقصان اٹھانا پڑا پھر بھی حضورؐ کو حکم الٰہی ہوا کہ ان سے مشورہ کریں۔ "انہیں معاف کر اور ان کے لئے بخشش مانگ اور معاملات میں ان کا مشورہ لے (۳:۱۵۸)۔ قرآن کریم سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو کئی اہم موقعوں پر مشاورت کے لئے جمع کیا گیا۔ مثلاً "مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں اور کسی بات کے لئے جہاں جمع ہونے کی ضرورت ہے اس کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو جاتے نہیں جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لیں" (۲۴:۶۲)

یہ انہی واضح ہدایات یعنی اپنے لئے قانون سازی کرنا اور اہم امور کا مشاورت کے ذریعہ فیصلہ کرنے کا اثر تھا کہ نبی صلعم کے شروع کے خلفاء کے ساتھ تمام امور میں ان کی مدد کرنے کے لئے کونسلیں تھیں۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں یہ بھی ہوتا تھا کہ عظیم اماموں نے (مثلاً امام ابوحنیفہ) قانون سازی میں قیاسی استدلال کا استعمال کیا اور اجتہاد کو قرآن اور سنتؐ کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون کے ماخذ کے طور پر جانا گیا۔ اس طرح جمہوریت کے دو اصول' قانون کی بالادستی اور نئی قانون سازی میں اور اہم امور میں مشورہ لینا خود نبی کریم صلعم نے مقرر فرمائے تھے۔ جمہوریت کا تیسرا اصول انہی سربراہ ریاست کا انتخاب بھی حضور صلعم نے منظور فرمایا۔ انہوںؐ نے تو یہاں تک فرما دیا کہ ایک سیاہ فام حبشی بھی عربوں کے اوپر حاکم مقرر کیا جا سکتا ہے اور کسی اور امیر کی طرح اس کی اطاعت بھی لازمی ہے! (بخاری ۱۰:۵۲)۔ یہ ان کی الٰہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ ان کی وفات کے بعد ان کے صحابہ کا پہلا کام سربراہ ریاست کا انتخاب تھا۔ جب آپؐ کی وفات کی خبر پھیلی تو مسلمان اکٹھے ہو گئے اور آزادانہ بحث کرنے لگے کہ نبی صلعم کے بعد سربراہ ریاست کون ہونا چاہئے۔ انصار یعنی مدینہ کے اصلی باشندے' رائے رکھتے تھے کہ دو سربراہ ہونے چاہئیں ایک انصار میں سے اور ایک قریش میں سے مگر ابوبکرؓ نے اس نظریہ کے غلط ہونے کی نشاندہی کی اور ایک فصیح اور بلیغ تقریر کے ذریعہ اس بات کو واضح کیا کہ ریاست کا صرف ایک ہی سربراہ ہو سکتا ہے (بخاری ۶۲:۶)۔ سو ابوبکرؓ کو منتخب کر لیا گیا کیونکہ وہ بقول حضرت عمرؓ ان سب سے زیادہ بہترین تھے اور "ان کے معاملات کو کنٹرول کرنے کے معاملہ میں مسلمانوں میں سب سے زیادہ موزوں" (بخاری ۹۳:۲)۔ حکمرانی کرنے کی اہلیت ہی اس الیکشن کا فیصلہ کرنے کے لئے صرف واحد معیار تھا جیساکہ حکم قرآنی ہے: "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو" (۴:۵۸)۔ اعلان کیا گیا کہ عدل و انصاف اس ریاست کا جس کی بنیاد حضور نبی صلعم نے رکھی کونے کا پتھر ہو گا۔ اور منصفانہ سلوک کرنے میں پسند اور ناپسند کا امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کے لئے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو' اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو" (۵:۸)۔ "اے لوگوں جو ایمان لائے ہو' انصاف پر قائم ہونے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو گو (معاملہ) تمہاری اپنی ذات یا ماں باپ یا قریبیوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا (تمہاری نسبت) زیادہ خیرخواہ ہے' سو خواہش کی پیروی نہ کرو تاکہ عدل کر سکو اور اگر تم پیچ دار بات کرو یا (حق سے) اعراض کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے" (۴:۱۳۵)۔ کسی بھی ریاست میں لوگوں کو دوسروں پر اختیار دیا جاتا تھا مگر صاحبان اختیار کو مکرر تنبیہہ کی گئی ہے وہ ان اعمال کے بارہ میں جو انہوں نے اپنی اتھارٹی کے استعمال کے دوران کئے ہوں گے اولاً خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ مندرجہ ذیل تنبیہہ جو حضرت داؤد کو کی گئی وہ ہر سچے مومن کے لئے بھی تنبیہہ ہے:

"اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔ وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بہک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اس لئے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے" (۳۸:۲۶)۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت

حقائق اور واقعات کی روشنی میں

ناصر احمد بی اے۔ ایل ایل بی

(متن تقریر جو احمدیہ انجمن ٹرسٹ' ہیگ کے سینٹر میں ۸ دسمبر ۱۹۹۶ء کو کی گئی)

"وہ ذات پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے (محمدؐ) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ بابرکت بنایا' تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ وہ سننے والا دیکھنے والا ہے" (۱:۱۷)۔

"ستارہ گواہ ہے جب وہ ڈوبتا ہے۔ تمہارا ساتھی گمراہ نہیں ہوا اور نہ وہ بہکا ہے۔ اور نہ خواہش نفس سے بولتا ہے۔ یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔ اسے مضبوط قوتوں والے نے سکھایا ہے' حکمت والے نے۔ سو وہ اعتدال پر قائم ہوا۔ اور وہ بلند انتہائی مقامات پر ہے۔ پھر قریب ہوا اور بہت قریب ہوا۔ سو وہ دو کمانوں کا تر ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب۔ سو اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی' جو وحی کی۔ جو اس نے دیکھا وہ دل نے جھوٹ نہیں کہا۔ تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے۔ اور اس نے اسے ایک اور نزول کے وقت بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہی کے پاس۔ اسی کے پاس جنت ہے جو اصل ٹھکانا ہے۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا۔ جو چھا رہا تھا' آنکھ پھری نہیں اور نہ حد سے بڑھی۔ اس نے اپنے رب کے بڑے بڑے نشانات دیکھے" (۵۳:۱-۱۸)۔

خواتین و حضرات! میں نے ابھی سورۃ بنی اسرائیل اور سورہ نجم سے چند آیات اور ان کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے جن میں واقعہ معراج کا ذکر ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اسلامی تاریخ کے اس نہایت اہم روحانی واقعہ کے متعلق گفتگو کریں کہ یہ کب' کس جگہ اور کس طریق پر ہوا اور کون سے اہم احکامات اس موقع پر نازل ہوئے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذہن میں اس عظیم واقعہ کے عظیم مقاصد کو واضح طور پر سمجھ لیا جائے۔ اس واقعہ کے ذریعہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسول اکرم صلعم سے اپنی محبت اور قربت کا ایسے عظیم الشان طریق پر اظہار کیا جس کی مذہبی دنیا میں نہ کبھی پہلے مثال ملتی ہے اور نہ کبھی آئندہ ملے گی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ' احمد مجتبیٰ' محبوب خدا صلعم کو وہ بلندی' عزت اور شان عطا فرمائی ہے جس سے آگے انسانی ذہن کی سوچ کا جانا ممکن نہیں۔ اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد۔ واقعہ معراج میں اللہ تعالیٰ نے رسول خدا صلعم کو سات آسمانوں کی سیر کروائی اور پھر اپنے اتنا قریب بلایا کہ حضرت جبرائیل بھی اس جگہ جانے کی ہمت نہ کر سکے۔ یعنی ایک رنگ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت اور شفقت کا اظہار اتنے پیارے اور بھرپور انداز میں کیا اور آپ صلعم کو عظمت' عزت اور شان کی اتنی بلندی عطا کی جو اور کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ اللھم صلی علی محمد۔

معراج جسمانی ہوا تھا یا روحانی' اس سے بڑھ کر اہم بات جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں اور خوشی منائیں کم ہے' یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمارے نبی اکرم صلعم کو زمین کی وسعتوں اور آسمان کی بلندیوں سے بڑھ کر عزت' عظمت اور شان عطا کی اور آپؐ کے ذریعہ امت کو وہ اسوہ حسنہ عطا کیا جس پر عمل کر کے قیامت تک وہ خدا کی بخشش اور اس کی نگاہ میں عزت اور ترقی حاصل کرتی رہے گی۔

واقعہ معراج میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا بھی ذکر ہے۔ اس جگہ اکثر ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کو ہم جسمانی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں آپ کی توجہ قرآن مجید کے اس حصہ کی طرف دلاؤں گا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے درمیان اس سلسلہ میں گفتگو کی تفصیل درج ہے۔

قرآن مجید میں اس کی تفصیل یوں ہے:

"اور جب موسیٰؑ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا۔ کہا' میرے رب مجھے (اپنا آپ) دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں۔ کہا تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن پہاڑ کی طرف دیکھ 'اگر یہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تو تو مجھے بھی دیکھ لے گا۔ پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اس کو ریزہ ریزہ کردیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر گیا' پھر جب ہوش میں آیا تو کہا تو پاک ہے میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں" (۷:۱۴۳)۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے اصرار پر اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ اے میرے رب اپنے آپ کو دکھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ یعنی یہ تیرے بس میں نہیں کہ تو میرے جلال کو جسمانی آنکھ سے دیکھ سکے اور پھر اسے برداشت بھی کرسکے۔ اگر تجھے اس بات کا یقین نہیں تو دیکھ میں صرف تھوڑی سی تجلی اس پہاڑ پر کرتا ہوں۔ پھر دیکھتا ہوں کہ تو اس کو کس حد تک برداشت کرتا ہے اور اس سے پہاڑ کا کیا حال ہو گا۔ چنانچہ جب خدا تعالیٰ کی ایک تجلی پہاڑ پر ہوئی تو پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور حضرت موسیٰؑ بے ہوش ہو گئے یعنی اس ایک تجلی کو بھی برداشت نہ کرسکے اور اپنی اس غلطی پر خدا کی بخشش مانگنے لگے۔

حضرت موسیٰؑ تو خدا کی تجلی کی ایک جھلک پر ہی بے ہوش ہو گئے لیکن یہاں معراج میں خدا تعالیٰ نے اپنی پوری شان اور جلال رسول اکرم صلعم پر ظاہر کیا اور آپ صلعم کو اتنے قریب بلا کر گفتگو کی جس سے اور زیادہ قربت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ قرآن مجید کے وہ الفاظ سنئے جن میں خود اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قربت کو بیان کیا ہے:

"اور وہ بلند انتہائی مقامات پر ہے۔ پھر قریب ہوا اور بہت قریب ہوا۔ سو وہ دو کمانوں کا وتر ہوا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قریب" (۵۳:۷-۹)۔

قاب قوسین او ادنیٰ کی حقیقت کو تفسیر بحر المحیط میں یوں بیان کیا گیا:

"ایام جاہلیت میں عرب جب ایک دوسرے سے مضبوط عہد کرتے تھے تو وہ دو کمانیں نکالتے تھے اور ایک کو دوسری کے ساتھ ملا دیتے تھے اور دونوں کے قاب مل جاتے تھے یہاں تک کہ وہ گویا ایک ہی قاب والی ہو جاتی تھیں پھر ان دونوں کو اکٹھا کھینچتے اور ان سے ایک ہی تیر چلاتے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوتا کہ ان میں سے ایک کی رضامندی دوسرے کی رضامندی ہے اور ایک کی ناراضگی دوسرے کی ناراضگی اور اس کے خلاف ممکن نہیں"۔

پس مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کا اللہ تعالیٰ سے ایسا قرب شدید کا تعلق ہوا جس سے بڑھ کر قرب ممکن نہیں اسی لئے قاب قوسین کے بعد او ادنیٰ کے الفاظ بڑھائے ہیں یعنی گو دو کمانوں کے ملانے والوں کا تعلق بھی بہت شدید ہوتا ہے مگر آنحضرت صلعم کا تعلق اللہ تعالیٰ سے۔ اس سے بھی قریب تر تھا یعنی انسانی تعلقات جس قدر قرب کو ظاہر کرسکتے ہیں اس سے بڑھ کر آپ کا تعلق ہے۔ پس فاستوی میں اخلاق کے کمال کا ذکر کیا ہے اور دنا فتدلی میں قرب الٰہی کے کمال کا ذکر کیا ہے۔

درحقیقت حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری یہ جسمانی آنکھ خدا کے وجود کی ایک جھلک بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ اس لئے خدا کو دیکھنے اور اس سے ہم کلام ہونے کے لئے جسمانی کی بجائے روحانی ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ بات میں ایک اور مثال کے ذریعے بھی بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہماری یہ آنکھ سورج کی انتہائی تیز اور گرم روشنی کو نہ دیکھ سکتی ہے' اور نہ برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ ایک شیشے کا سہارا لیں اور اس میں سورج کے عکس کو لے لیں تو آپ کی یہ جسمانی آنکھ سورج کے اس انتہائی تیز اور جلا دینے والی روشنی کو دیکھ سکتی ہے۔ یعنی جب آپ نے ایک ایسا ذریعہ استعمال کیا جس میں سورج کی تیز اور جلانے والی روشنی منعکس ہو کر آپ کی آنکھ تک پہنچی تو آپ اس کو دیکھ سکے۔ اسی طرح جب خدا کا جلال رویا یا کشف کے ذریعہ ہم پر ظاہر ہوتا ہے تو انسان کی روحانی آنکھ اس کو دیکھ سکتی ہے۔ چنانچہ جب خدا کے بندے روحانی بلندی حاصل کرلیتے ہیں تو ان کو روحانی آنکھ عطا کردی جاتی ہے جس کے ذریعے وہ خدا کی تجلی اور دوسری دنیا کے نظارے دیکھ لیتے ہیں۔ جس طرح سورج کے سلسلہ میں میں نے شیشہ کو بطور ذریعہ کے بیان کیا تھا اسی طرح خدا کا کلام وحی کے ذریعہ سنا جاتا اور اس کا جلال رویا اور کشف کے ذریعے دیکھا جاتا ہے۔ اس ذریعہ کو ہم آج کی سائنسی زبان میں MEDIUM کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح فضا میں ہر قسم کی آوازیں گھوم رہی ہیں لیکن جب تک آپ کے پاس ریڈیو سیٹ نہیں تو آپ ان آوازوں کو سن نہیں سکتے اور جس طرح فضا میں تمام ٹیلیویژن پروگرام گھوم رہے ہیں لیکن جب تک آپ کے پاس مناسب ٹیلیویژن سیٹ نہیں تو آپ ان

پروگراموں کو دیکھ نہیں سکتے۔ اسی طرح مختلف چیزوں کے سننے اور دیکھنے کے لئے مختلف ذرائع یا MEDIUMS کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس خدا کو دیکھنے کے لئے رویا اور کشف ایسا ہی ایک ذریعہ یا MEDIUM ہے۔ کشف کی حالت میں گو انسان جسمانی طور پر اس دنیا میں ہوتا ہے لیکن اس کے وجود کا ہر عضو ایک دوسری دنیا کے نظاروں کو دیکھتا اور کیفیات کو محسوس کر رہا ہوتا ہے اور ان سے لطف اٹھا رہا ہوتا ہے۔

کشفی حالت خواب سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ ہم میں سے اکثر نے سوتے ہوئے خواب میں ایسے نظارے دیکھے ہوں گے یا ایسے کام کئے ہوں گے یا ایسی کیفیات محسوس کی ہوں گی جو بالکل اسی طرح ہوتی ہیں جس طرح انسان عام زندگی میں مختلف حالات اور کیفیات سے گزرتا ہے۔ یہ روحانی حالت کی ہی ایک نہایت ہی معمولی صورت ہے جو عام آدمی کے تجربہ میں بھی آتی ہے۔

مذہب کا تعلق چونکہ جسم اور روح دونوں سے ہوتا ہے اس لئے وہ اکثر روحانی باتوں کو سمجھانے کے لئے اس جسمانی دنیا کے الفاظ اور کیفیات کا ذکر کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے انگلستان کے ایک روشن خیال پادری کی کتاب کا خیال آرہا ہے جس کا نام اس نے HONEST TO GOD رکھا یعنی خدا سے دیانتداری کا اظہار۔ اس میں اس نے عیسائیوں سے درخواست کی ہے کہ اب تک ہم آسمان' زمین' جنت اور دوزخ کے متعلق جو تصور لوگوں کو بتاتے تھے موجودہ سائنس نے ان کی حقیقت بالکل بدل کر رکھ دی ہے۔ مثلاً آسمان وہ نہیں جو ہمیں نظر آتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کا تخت ہے جہاں سے وہ فرشتوں کو حکم دیتا ہے اور جنت اور دوزخ اس پر واقع ہیں' یہ تو محض فضا کی گہرائی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اسی لئے تو روس کے سابق صدر خروش چوف نے جب پہلا سپٹنک فضا میں چھوڑا تو مذاق کے رنگ میں یہ کہا کہ ہمیں تو آسمان پر کوئی خدا نظر نہیں آیا۔ قرآن مجید کا اعجاز دیکھیں کہ اس نے لفظ سماوات استعمال کیا ہے یعنی کئی آسمان صرف ایک نہیں۔ کیونکہ زمین پر رہنے والے ہر خطہ کے لوگوں کے لئے ان کے اوپر کی فضا آسمان ہے بلکہ ہمارے نظام شمسی کے علاوہ کئی اور ایسے ہی نظام ہیں اور اس طرح آسمان بھی۔ اکثر ہم اپنے محدود علم کے مطابق روحانی دنیا کی چیزوں یا کیفیات کے متعلق ایک تصور باندھ لیتے ہیں جس کی وجہ سے اصل حقیقت کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

زمین کی مٹی کے اس ذرہ میں جو ہماری آنکھ بھی دیکھ نہیں سکتی۔ اس میں کیا طاقت چھپی ہوئی ہے اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ایک سائنس دان سائنسی طریق پر اس کو پھاڑتا ہے تو اس سے ATOMIC طاقت پیدا ہوتی ہے اور ایٹم بم بھی بنتا ہے جس کی تباہ کاریوں سے آج ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ اسی طرح خدا کی حقیقت کیا ہے دنیا میں اس کے جلال کا اظہار کس طرح پر ہو رہا ہے اس حقیقت کو کھولنے والے خدا کے انبیاء اور اولیاء ہوتے ہیں جو وحی اور کشف کے ذریعہ لوگوں کو روحانی حقیقتوں کی خبر دیتے اور سمجھاتے ہیں۔

معراج کا واقعہ اس روحانی بلندی اور کمال کی نشاندہی کرتا ہے جس کے ذریعہ انسان خدا کے قرب اور اس کی نعمتوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ ہر انسان کس حد تک ان حقیقتوں کو جان سکتا اور خدا کے قریب ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی اپنی کوشش اور صلاحیت پر منحصر ہے۔ اس لئے قرآن مجید فرماتا ہے لیس للانسان الا ماسعی کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس حد تک وہ کوشش کرتا ہے۔

خواتین و حضرات! بات اللہ تعالیٰ کے وجود کو ان مادی آنکھوں سے دیکھنے کی ہو رہی تھی اور میں نے اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا تھا کہ خدا کے صرف ایک جلال کی جھلک سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ پھر میں نے آپ کو سورج کی مثال بھی بیان کی تھی کہ ہم براہ راست اس کو اپنی ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ہاں جب اس کا عکس شیشے میں لے لیا جائے تو انسانی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔ تو شیشہ ایک ذریعہ یا MEDIUM بن گیا جس کے ذریعہ انسان ایسی چیز کو دیکھنے کے قابل ہو گیا جس کو بظاہر وہ دیکھ نہیں سکتا۔ کشف روحانی چیزوں کو دیکھنے کا ایک ذریعہ یا MEDIUM ہے۔ اسی لئے جب رسول خدا صلعم نے واقعہ معراج کا ذکر قریش مکہ سے کیا کہ آپ صلعم بیت المقدس گئے تھے تو قریش مکہ نے بیت المقدس کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ بخاری میں درج ہے کہ اس وقت کشفی طور پر پورا بیت المقدس آنحضرت صلعم کے سامنے آگیا اور آپ قریش مکہ کے سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے۔ قریش مکہ تو سمجھے ہوں گے کہ آپ اپنی یادداشت سے تفصیل بیان کر رہے ہیں لیکن آنحضرت صلعم اپنی روحانی آنکھ سے پورا بیت المقدس کشفی طور پر دیکھ رہے تھے۔

معراج کے موضوع کے سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ کتاب "قرآن اور انسان" کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں جو گذشتہ سال شائع ہوئی ہے۔

یہ کتاب ایک مشہور اشاعتی ادارے فیروز سنز' لاہور' پاکستان نے شائع کی ہے۔ اس میں مصنف صفدر حسین صدیقی نے دینی اور سماجی مسائل پر قرآن کی آیات کو اس خوبصورت انداز میں ترتیب دیا ہے کہ موضوع کے متعلق قرآنی آیات ایک مضمون کی شکل میں سامنے آجاتی ہیں۔ کتاب کا مصنف حضرت مولانا محمد علی مرحوم کے قرآن مجید کے اردو ترجمہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس کتاب میں آیات کا ترجمہ زیادہ تر مولانا محمد علی مرحوم کے ترجمہ قرآن سے حاصل کیا گیا ہے کیونکہ وہ قرآن مجید کا بڑی حد تک لفظی ترجمہ ہے' ترجمانی نہیں اور اس وجہ سے یہ منشاء ایزدی کو اردو زبان میں زیادہ بہتر طور پر بیان کرتا ہے" (ص ۲۹)۔

خواتین و حضرات' اس زمانہ میں جبکہ پاکستان میں احمدی لٹریچر پر پابندی ہے اور حکومت پاکستان نے احمدیوں کو کافر قرار دے کر اور مسلسل غلط پراپیگنڈا کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں نفرت اور ذہنوں میں زہر بھر دیا ہے۔ ایک غیر احمدی مصنف کا حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم کے قرآن کے ترجمہ کو منشاء ایزدی یعنی خدا کے مقصد کا اظہار قرار دینا' نہ صرف ایک نہایت جرات کا کام ہے بلکہ حضرت مولانا کے ترجمہ قرآن کے متعلق اب تک کئے جانے والے تبصروں میں سب سے بہترین تبصرہ ہے۔

اس کتاب میں معراج کے عنوان کے تحت مصنف نے پہلے تو سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱ اور سورہ نجم کی آیات ۱ تا ۱۸ کا ترجمہ درج کیا ہے اور پھر معراج کے متعلق ذیل کے نوٹ لکھے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"معراج نبوی جسد عنصری سے نہیں بلکہ ان کی اپنی روح کے ساتھ تھا۔ اس حالت میں معراج ہوا جبکہ آپ صلعم کا قلب دیکھتا تھا۔ انسان کا مادی جسم تو فانی ہے مگر اس کی روح اور جان لافانی ہیں۔"

پھر یہی مصنف لکھتا ہے:

"سدرہ سے مراد ایک خاص مقام ہے جس سے آگے کسی انسان کا علم ترقی نہیں کر سکتا' اور آپؐ کا علم ایسا کامل ہوا کہ قیامت تک اب کوئی ترقی عملی اس کو باطل نہیں کر سکتی اور یوں علم اور عمل دونوں کے لحاظ سے آنحضرتؐ کی وہ تکمیل کی گئی جس سے آگے انسان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ آپؐ کو وہ کمال حاصل ہوا جو دوسرے کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا" (ص ص ۱۳۵' ۱۳۶)۔

خواتین و حضرات' یہ بات ذہن میں رکھیں کہ معراج کے متعلق یہ تشریحی نوٹ ایک غیر احمدی مصنف کے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بخاری کی ذیل کی احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے کتاب کے اس مصنف نے اپنے نوٹ میں اس کا نہایت خوبصورت خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

مثلاً بخاری کتاب ۶۱ باب ۲۴ میں یہ الفاظ آتے ہیں:

"وہ یعنی حضرت جبرائیل کسی اور رات آئے ایسی حالت میں کہ آپؐ کا دل دیکھ رہا تھا اور آپؐ کی آنکھ سوئی ہوئی تھی اور آپؐ کا دل نہ سوتا تھا۔"

اسی طرح بخاری کتاب ۵۹ باب ۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

"میں یعنی آنحضرت صلعم نیند اور جاگنے کی حالت میں تھا۔"

پھر بخاری کتاب ۹۸ باب ۳۷ میں یہ الفاظ آتے ہیں:

"آپ صلعم جاگ اٹھے اور آپ مسجد حرام میں تھے۔"

مختصراً یہ کہ واقعہ معراج کشفی حالت میں ہوا جب آنحضور صلعم کی جسمانی آنکھ تو سو رہی تھی لیکن آپ صلعم کا قلب یعنی مرکز روح جاگ رہا تھا۔ قرآن مجید نے بھی معراج کے متعلق سورہ بنی اسرائیل میں لفظ رویا استعمال کیا جیسا کہ فرمایا وما جعلنا الرویا التی اریک فتنۃ للناس "ہم نے اس رویا کو جو تجھے دکھایا صرف لوگوں کے لئے فتنہ بنایا" (۱۷:۶۰)۔

پیشتر اس کے کہ میں واقعہ معراج کے متعلق مزید گفتگو کروں چند باتوں کی وضاحت کرتا چلوں۔

معجزہ ایسا واقعہ ہوتا ہے جس کو انسانی عقل اپنے محدود علم کی وجہ سے سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا لیکن وہ قانون قدرت کے خلاف ہرگز نہیں ہوتا۔ مثلاً کفار مکہ نے جب آنحضرت صلعم سے بیت المقدس کے متعلق سوالات شروع کئے تو کشفی رنگ میں بیت المقدس آپ صلعم کو دکھایا گیا۔ آج ٹیلیویژن کے ذریعہ ہزارہا میل دور ہونے والے کرکٹ میچ یا واقعات آپ گھر بیٹھے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ کرکٹ میچ تو آپ خود بھی جا کر دیکھ سکتے ہیں لیکن جب کرکٹ میچ آپ کو ٹیلیویژن کے ذریعہ گھر بیٹھے دکھا دیا جائے تو یہ کمال ہے جو ٹیلیویژن کے ذریعہ ممکن ہوا۔ اسی طرح اگر فرض کر لیا جائے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے جسم کے ساتھ حضرت جبرائیل کے ذریعہ سات آسمانوں کی سیر کی اور خداوند قدوس سے ملاقات کی تو کیا اس سے زیادہ کمال یہ نہیں کہ آنحضرت صلعم کو گھر بیٹھے یہ ساری سیر اور ملاقات حاصل ہو جائے۔ اسی

طرح اگر صرف دیگر تمام انبیاء کی امامت کروانا ہی بیت المقدس لے جانے کا اصل مقصد تھا تو وہ تو کعبتہ اللہ میں بھی ہو سکتا تھا بلکہ اس طرح تو کعبتہ اللہ کو اور زیادہ عزت و شرف حاصل ہو جاتا۔

درحقیقت بیت الحرام سے بیت المقدس کا سفر، تمام گذشتہ انبیاء کی امامت، سات آسمانوں کی سیر اور خداوند عالم سے ملاقات کے ذریعہ آنحضرت صلعم کی روحانی بلندیوں کا اظہار کرنا، اوائل کے زمانہ میں سخت ترین مشکلات میں خدا کی نصرت کی یقین دہانی اور مستقبل میں آنحضرت صلعم کی کامیابیوں کی پیشگوئی کرنا مقصود تھا۔ جس کی تفصیل میں ابھی تھوڑی دیر کے بعد بیان کروں گا۔

اب میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان سے شائع شدہ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے معراج کے متعلق مضمون سے چند حصے سناتا ہوں تاکہ اس واقعہ کے مختلف پہلوؤں پر ایک مستند اور عالمانہ رائے کا بھی آپ کو علم ہو جائے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا، ہالینڈ سے شائع شدہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ جہاں جہاں مغربی مفکرین نے غلط بیانی اور اسلام کے متعلق صحیح علم نہ ہونے کی وجہ سے غلطیاں کی ہیں ان کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ حکومت پاکستان نے یہ کام ایک خاص شعبہ کے سپرد کیا ہے جس کو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منسلک کر دیا گیا ہے گویا ایک رنگ میں اس ادارہ کو حکومت پاکستان کی پوری پوری تائید حاصل ہے۔

اب اس اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے معراج کے بارے میں چند حصے سنئے۔

> "معراج: (ع) مادہ ع رج (= عرج سے عروجا) اس کے لغوی معنی بصیغہ اسم آلہ 'سیڑھی کے ہیں' اور اصطلاحا" بلندی اور روحانی کمال، خاص کر تقرب الٰہی حاصل کرنے پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے واقعہ معراج کی بحث مطلوب ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ بنی اسرائیل کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ سبحن الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام ..... الایۃ اس کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے آسمانی سفر سے ہے۔ اس آیت کی تفسیر و تعبیر کئی طرح سے کی گئی ہے۔ بعض اس سفر آسمانی کو محض رؤیا کہتے ہیں ...... لیکن اصطلاحا" معراج کا جس واقعے پر اطلاق ہوتا ہے اس کا تعلق قریش کے شدید سماجی مقاطعے اور شعب ابی طالب کے محاصرے کے بعد اور اولین بیعت عقبہ سے قبل سے ہے ...... سید سلیمان ندوی (دیکھئے سیرۃ النبی ۳ واقعہ معراج) نے قرآن مجید کی آیت و ان کادوا لیستفزونک من الارض (۱۷:۷۶) سے استدلال کیا ہے کہ یہ ہجرت کا حکم یا اس کی پیشگوئی ہے (جمہور کے نزدیک اسرا اور معراج کا واقعہ ایک ہی شب میں پیش آیا اور وہ ۲۷ رجب کی رات تھی دیکھئے الزرقانی: شرح مواهب اللدنیہ ۱:۳۵۵ ببعد)

قرآن مجید میں معراج کا ذکر بنی اسرائیل ۱۷:۱، ۵۳ سورۃ النجم ۱ تا ۱۸، التکویر ۸۱:۱۹ تا ۲۴ میں کیا گیا ہے......

مفسرین کے خیال کے مطابق سورۂ اسراء جو بنی اسرائیل کے نام سے بھی موسوم ہے، پوری کی پوری معراج ہی کے حالات پر مشتمل ہے۔ درمیان میں وعظ و ارشاد بھی ہے۔ اس سورۃ کا اجمالی خاکہ یہ نظر آتا ہے کہ ابتدا میں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بجا طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک پہنچایا گیا۔ اس کے بعد دنیوی تکالیف سے رنجور نہ ہونے کے لئے انبیائے سلف کے حالات یاد دلائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی مخالفین (قریش) کو عذاب کی وعید کی جاتی ہے۔ ضمنا" (اشارتاً) آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کو ہجرت کر جانے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ پھر معراج نبویؐ کے امت پر اثرات اور ان بارہ احکام کا ذکر ہے جو امت محمدی کو دیئے گئے ہیں: (شرک نہ کرو، ماں باپ کی عزت کرو، مستحقوں کا حق ادا کرتے ہوئے مسکینوں غریبوں سے حسن سلوک کرو، نہ اسراف کرو، نہ بخل، قتل اولاد نہ کرو، زنا کے قریب تک نہ جاؤ، ناحق کسی کو جان سے نہ مارو، یتیم کے مال کی دیانتداری سے حفاظت کرو، عہد پورا کرو، ناپ تول میں کمی نہ کرو، نادانی کی بات کا پیچھا نہ کرو، اکڑ کر نہ چلو)۔ پھر رسالت و نبوت، قرآن، قیامت اور روح کی حقیقت بھی سمجھائی گئی ہے اور خالق و مخلوق کے تعلقات کے سلسلے میں معراج نبوی اور نماز کا ذکر اور اس کے برکات تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ آخر میں حضرت موسیٰؑ کے حالات بھی ہمت بندھانے کے لئے بتائے گئے ہیں، یعنی یہ کہ ان کو بھی مصر

سے ہجرت کرنا پڑی' اور انہیں بھی خدا نے نو احکام (تسع آیات بینات) دیئے۔ النجم ۵۳:۱ تا ۱۸' التکویر ۸۱:۱۹ تا ۲۴ میں انسان کا منتہائے کمال بتایا گیا ہے لیکن قاب قوسین او ادنی ہونے کے باوجود انسان' انسان ہی رہتا ہے وہ خدا نہیں بن جاتا۔ وہ فنافی اللہ بے شک ہو جاتا ہے' وہ خدا کی زبان سے بولتا اور خدا کی مرضی ہی کے مطابق ہر کام کرتا ہے' لیکن انسان کامل اور نور محض (خدا) کے مابین ایک نورانی مخلوق .... کو واسطہ بنے رہنے کی بہرحال ضرورت رہتی ہے۔ رویت باری تعالیٰ کے متعلق (جو ایک معراج کی ضمنی بحث ہے) حضرت ابو ذرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ شدید القوی ذو مرۃ (وہ ایک نور ہے' میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں) اور حضرت عائشہؓ نے قرآن (۶:۱۰۳) سے استدلال کیا ہے کہ انسانی آنکھیں خدائے لطیف کا نظارہ نہیں کر سکتیں۔ (اسہیلی: الروض الانف ۱:۲۵۴)۔ بعض روایات مشاہدہ باری کی تائید میں بھی ملتی ہیں۔

معراج کے ذکر میں نماز کا بیان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس بناء پر بعض احادیث میں نماز کو معراج المومنین قرار دیا گیا ہے...

حضرت مالکؓ بن صعصعہ کی روایت میں مندرجہ ذیل زوائد ہیں کہ روانگی کے وقت خواب و بیداری کے مابین کوئی کیفیت تھی' حطیم کعبہ میں لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے۔ معراج کا ذریعہ براق تھا۔ سات آسمانوں میں جن جن پیغمبروں سے ملاقات ہوئی اس میں بھی تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ بہرحال پہلے آسمان میں حضرت آدمؑ دوسرے میں حضرت یحییٰؑ و عیسیٰؑ تیسرے میں حضرت یوسفؑ چوتھے میں حضرت ادریسؑ پانچویں میں حضرت ہارونؑ چھٹے میں حضرت موسیٰؑ ساتویں میں حضرت ابراہیمؑ کا نام زیادہ تر لیا جاتا ہے۔ معراج سے واپسی میں یا بعض روایات کے مطابق آسمان پر صعود سے پہلے بیت المقدس میں انبیاءؑ کی روحیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا استقبال کرتی ہیں اور آپ نماز دوگانہ ادا کرتے ہیں تو سب آپ ہی کو اپنا امام بناتے ہیں۔

واپسی کے بعد جب مکے میں چرچا ہوا تو ...... قریش نے صرف یہ پوچھا کہ اگر بیت المقدس دیکھا ہے تو اس کا منظر بیان کرو۔ سید سلیمان ندوی نے (سیرت النبی' جلد سوم) تحقیقی بحث کے سلسلے میں لکھا ہے کہ معراج پر روانہ ہونے پر بستر سے غائب ہونا' گھر والوں کا رات کو پہاڑوں میں تلاش کرنا' واپسی میں ایک قریشی کاروان تجارت سے راستے میں ملاقات کرنا' نیز اس خبر کے پھیلنے پر بہت سے لوگوں کا مرتد ہو جانا' یہ سب لغو قصے ہیں جن کی صحیح احادیث سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔ واقعہ معراج کو مسلمانوں کے ہاں قدرتاً بڑی اہمیت حاصل ہے......

معراج کے متعلق بعض عربی تالیفوں کا لاطینی ترجمہ تیرہویں صدی عیسوی ہی میں ہو چکا تھا۔ اسی کا چربہ لے کر اطالوی شاعر دانتے (۱۲۶۵ء تا ۱۳۲۱ء) نے اپنی مشہور نظم Divina Comedia (طربیہ ربانی) لکھی جس میں جنت اور دوزخ کی سیر کا ذکر ہے۔ اس کی تفصیل Asin نے اپنی کتاب IslamandDivineComedy میں دی ہے اور اس پر ابن عربی کے اثرات دکھائے ہیں۔ گذشتہ صدیوں میں غیر مسلم اہل قلم معراج پر جو خیال آرائی کرتے رہے ہیں اس میں مضحکہ خیز سطحیت نمایاں ہے۔ جزئیات و تفصیلات کے متعلق اسلامی روایات میں جو اختلاف ملتا ہے اس کو وہ ضرورت سے زیادہ نمایاں کر کے اپنی دانست میں "عالمانہ" تنقید کرتے ہیں جسے محض تعصب کہا جا سکتا ہے۔" (جلد ۲۰ ص ص ۳۴۶ تا ۳۵۰)۔

آپ نے دیکھا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرتبین نے بھی واقعہ معراج کی تفصیل کے علاوہ اس کی اہمیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

اب تک میں نے قرآن مجید' حدیث اور روشن خیال غیر احمدی مفکرین اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالے سے معراج پر روشنی ڈالی ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں اس موضوع پر مزید آگے چلوں یہ وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ احمدی طریق استدلال یہ ہے کہ ہمارے لئے قرآن مجید سب سے مقدم ہے۔ پھر بخاری کا درجہ آتا ہے اگر وہ قرآن مجید کی تائید کرے اور پھر مسلم اور دیگر احادیث کی کتب۔ اب قرآن مجید اس واقعہ کو رویا کہتا ہے۔ بخاری اسی بات کو یوں بیان کرتی ہے کہ آنحضرت صلعم کی آنکھ سوتی تھی اور دل جاگ رہا تھا' جو کشف کی کیفیت ہے۔ پھر میں نے مختلف طریق سے آپ

کو بتایا کہ خدا کے وجود اور دوسری دنیا کی نعمتوں کو دیکھنا انسان کی اس آنکھ سے ممکن نہیں اس کے لئے روحانی ذریعہ یا MEDIUM کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ذریعہ رویا یا کشف ہی ہوتا ہے جو تمام انبیاء اور اولیاء کو حاصل ہوتا ہے۔

ابھی آپ نے اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اقتباس میں شعب ابی طالب کا ذکر سنا تھا یہ مکہ کے قریب ایک گھاٹی تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جانثاروں کو تین سال تک ایک قید کی سی زندگی گذارنی پڑی۔ نہ ان کو کہیں آنے جانے دیا جاتا تھا نہ کہیں سے کوئی چیز ان تک پہنچ سکتی تھی۔ صرف حج کے دنوں میں ان کو آزادی حاصل ہوتی تھی۔ احادیث میں لکھا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کی اتنی قلت ہو گئی تھی کہ لوگ درختوں کے پتے کھا کر اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ معراج کا واقعہ اس تین سال کی قید کے فوراً بعد کا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلعم اور ان کے صحابہ کو ان کے ایمانوں کو مضبوط کرنے اور مستقبل میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی خوشخبری دینے کے لئے معراج کے ذریعہ یہ کشفی نظارے دکھائے۔

معراج کے متعلق سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں الفاظ لنریہ من ایاتنا یعنی تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ کی تشریح کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد علی صاحب تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں:

> "آنحضرت صلعم کا معراج اس غرض کے لئے تھا کہ آپؐ کو کچھ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دکھائی جائیں گویا جو باتیں آپؐ کو معراج میں دکھائی گئیں وہ کسی دوسری حقیقت کے لئے بطور نشان بھی تھیں اور در حقیقت معراج میں آنحضرت صلعم کے کمالات غیر متناہی کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ بتایا ہے کہ آپؐ اس بلند ترین مقام پر پہنچے ہوئے ہیں جہاں کوئی دوسرا انسان یا فرشتہ نہیں پہنچا اور یہ بھی ہو سکتا ہے اس اسرا میں اشارہ نبی کریم صلعم کی ہجرت کی طرف ہو۔
>
> واقعہ اسرا میں یعنی آنحضرت صلعم کے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے جانے میں یہ اشارہ ہے کہ بیت المقدس جو انبیائے بنی اسرائیل کا مقام تھا آنحضرت صلعم کے متبعین کو دے دیا جائے گا کیونکہ یہود یا عیسائیوں میں وہ لوگ نہ رہے تھے جو اس پاک سرزمین کے وارث قرار دیئے جاتے اور بموجب وعدہ خداوندی بھی ضروری تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کی دوسری شاخ اب اس پاک سرزمین کی مالک ہوتی۔ پس اصل اشارہ اس طرف ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل کی برکات کا وارث بھی حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کو کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ معراج میں کل انبیاء کا آپؐ کے اقتدا میں بیت المقدس میں نماز پڑھنا دکھایا گیا اور قرآن شریف میں معراج کا ذکر صرف اس قدر ہے جو یہاں ہوا یعنی بیت المقدس کو لے جانے کا ذکر۔ آسمانوں کا ذکر نہیں جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں بیت المقدس کے آنحضرت صلعم کو دیا جانے اور انبیاء سابق کی تمام برکات کا وارث کیا جانے کی طرف ہی خاص اشارہ ہے۔"

ہماری جماعت کے ایک اور عالم اور مفسر قرآن حضرت ڈاکٹر بشارت احمد صاحب نے اس موضوع پر کئی ایک پہلو سے دلچسپ تشریحات کی ہیں۔ اس وقت ان میں صرف چند کا ذکر کرتا ہوں۔

خدا کا قرب: خدا سے قرب کے مراتب انسان کی روح کو حاصل ہوتے ہیں نہ کہ جسم کو، مادی جسم کا خدا کی طرف اونچا ہونا یا اٹھنا یا اس کے قریب ہونا ایک بے معنی سی بات ہے۔ خدا کوئی مادی یا محدود چیز نہیں نہ وہ کسی مقام میں محدود ہے کہ انسان کا مادی جسم جو مادی حد بندی کے قیود کا پابند ہے اس سے نزدیک یا دور ہو سکے۔ کیا جو لوگ پہاڑ پر رہتے ہیں یا ہوائی جہازوں میں اڑتے ہیں ان کی نسبت کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا کے قریب ہو گئے یا خدا کے مقرب ہیں۔ پس خدا سے قرب کے منازل جسم کے آسمان کی طرف اٹھنے سے طے نہیں ہوتیں۔ بلکہ خدا کی فرمانبرداری سے طے ہوتی ہیں اور جیسے جیسے بندہ فرمانبرداری میں ترقی کرتا اور خدا کے آگے جھکتا ہے۔ ویسے ویسے وہ واسجد واقترب کے تحت خدا کی طرف روحانی پرواز کرتا اور اس سے قریب ہوتا جاتا ہے اور لترکبن طبقا عن طبق (انشقاق ۸۴:۱۹) کے ماتحت ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف اوپر چڑھتا .... اور خدا سے نزدیک ہوتا چلا جاتا ہے۔

معراج کی حقیقت

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مراتب روحانی طے کر کے اللہ تعالیٰ کے قرب کے اس انتہائی مقام پر پہنچ گئے جسے قرآن کریم نے ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی (النجم ۵۳:۹) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی کہ خدا سے اس قدر نزدیک ہوا جو نزدیک ہونے کا انتہائی مقام ہے اور مخلوق کی طرف جھکا یعنی مخلوق کی ہمدردی اور شفقت میں آپؐ کی جان اس قدر گداز ہوئی کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔ پس ایک طرف خدا سے واصل اور دوسری طرف مخلوق میں داخل ہو کر آپؐ دونوں قوسوں یعنی قوس الوہیت اور قوس عبودیت کا در میانی وتر یعنی تمام مخلوق کا اس کے خالق سے تعلق جوڑنے کے لئے واسطہ اور شفیع بن گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ قرب کا درجہ اگر متصور ہو سکتا ہے تو آپؐ نے اس انتہائی مقام کو بھی پالیا اور یہی وہ حقیقی معراج تھا جو ہمہ وقت آپؐ کو حاصل تھا اور اسی روحانی پرواز اور قرب الٰہی کی مختلف منازل کو عین حالت بیداری میں بذریعہ ایک کشف کے آپؐ کو دکھایا گیا، جسے عرف عام میں معراج کہتے ہیں۔ وہ ایک نورانی جسم ہوتا

ہے جو حالت کشف میں مقربین الٰہی کو ملتا ہے' اور جو تمام مراتب عالیہ کو طے کرتا نظر آتا ہے۔

بعض معبرین کی تعبیریں

الغرض معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مراتب قرب الٰہی کا نظارہ دکھانا مقصود تھا جس پر آپؐ فائز المرام ہو چکے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ نظارہ روحانی ہی ہو سکتا ہے نہ کہ جسمانی۔ لنریہ من ایاتنا کی تفسیر میں بعض مفسرین نے اس سے کشف کے مختلف حصوں کی تعبیر بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ معراج میں علاوہ آپؐ کے مراتب روحانی کے نظاروں کے آپؐ کو بڑی بڑی آیات اور نشانات بھی دکھانے مد نظر تھے اور وہ آپؐ کے مستقبل کے متعلق بڑی بڑی عظیم الشان پیشگوئیاں تھیں جو انہی نظاروں کے اندر نہاں تھیں۔ ان میں سے بعض کا یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) جو شخص کسی رویا یا کشف میں دیکھے کہ وہ براق پر سوار ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ مراتب عالیہ پر پہنچے گا اور اس کو سفر میں عزت ملے گی اور جہاں سے گیا ہے وہاں باعزت واپس ہو گا۔ یہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی پیشگوئی تھی اور اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ آپؐ جہاں تشریف لے جائیں گے وہاں بڑی عزت پائیں گے اور ہر قسم کے مراتب عالیہ کے وارث ہوں گے اور پھر عزت کے ساتھ مکہ معظمہ کو واپس ہوں گے جیسا کہ فتح مکہ کے وقت ہوا۔

(۲) جو شخص کسی رویا یا کشف میں دیکھے کہ وہ پہلے آسمان پر گیا ہے۔ اس کی عمر بہت لمبی نہ ہو گی چنانچہ آنحضرتؐ کی وفات ۶۳ سال میں ہوئی۔

(۳) اور جو دیکھے کہ وہ دوسرے آسمان پر گیا ہے اسے علم اور حکمت بے اندازہ ملے گا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔

(۴) اور جو دیکھے کہ وہ تیسرے آسمان پر گیا ہے اس کی عزت اور اقبال زیادہ ہو گا۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا۔

(۵) اور جو دیکھے کہ وہ چوتھے آسمان پر گیا ہے' وہ بادشاہوں کی نظر میں معزز ہو گا چنانچہ دیکھ لیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف بادشاہوں کی نظروں میں معزز ہوئے بلکہ آپؐ کی امت میں سینکڑوں ہزاروں بادشاہ ہوئے جنہیں فخر تھا کہ وہ آپؐ کے غلام ہیں۔

(۶) اور جو یہ دیکھے کہ وہ پانچویں آسمان پر گیا ہے اس کو جزع و فزع و مشکلات پیش آئیں گی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑھ کر مشکلات کا سامنا ہوا۔ جس سے آپؐ کے صبر و استقامت' شجاعت اور رضاء بقضاء کے اخلاق فاضلہ ظہور میں آئے۔

(۷) اور جو دیکھے کہ وہ چھٹے آسمان پر گیا ہے اس کو سعادت و جاہ حاصل ہو گا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو باوجود ہر قسم کی مشکلات کا سامنا ہونے کے آخر کار اس قدر سعادت اور جاہ و جلال حاصل ہوا کہ دنیا میں کسی انسان کو حاصل نہیں ہوا۔

(۸) اور جو دیکھے کہ وہ سدرۃ المنتہی تک پہنچ گیا ہے اس کی ساری آرزوئیں اسی دنیا میں حاصل ہوں گی اور وہ کامیاب ہو گا اور دین و دنیا کی بادشاہی کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے گا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ساری مرادیں اسی دنیا میں آپؐ کو خدا نے عطا فرمائیں اور جس مشن کو لے کر آپؐ کھڑے ہوئے تھے اس میں پوری پوری کامیابی کے بعد آپؐ دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں محققین یورپ کو بھی ماننا پڑا ہے کہ مذہبی شخصیتوں میں آپؐ سے بڑھ کر کوئی کامیاب انسان نہیں گزرا اور آپؐ ہی وہ عظیم الشان شخصیت ہیں جس کے سر پر دین و دنیا کی بادشاہت کا تاج ایسے جاہ و جلال کے ساتھ رکھا گیا کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں۔

(۹) اور جو شخص رویا یا کشف میں جناب الٰہی کی زیارت کرے اس کا انجام بخیر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اور کس کا انجام بخیر ہوا۔

(۱۰) اور بیت المقدس میں جا کر نبیوں کی امامت کرانے میں جہاں آپؐ کے تمام نبیوں کے سردار ہونے کی طرف اشارہ تھا۔ وہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ تھا کہ بیت المقدس کی امامت بھی اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرائیں گے۔ یعنی وہ تمام ممالک جن پر بنی اسرائیل کے بادشاہوں کا قبضہ تھا اور جن کا مذہبی مرکز بیت المقدس تھا سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو دیئے جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

غرضیکہ معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عجائبات بے اندازہ ہیں اگر اس کے ہر ایک نظارہ اور واقعہ کی تشریح اور تعبیر تفصیل سے کی جائے تو ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ (بشارات احمدیہ جلد سوم ص ص ۱۰۱ تا ۱۰۹)

انگریزی سے ترجمہ

بے نظیر روحانی انوار کا الہٰی سرچشمہ - ۵

شیخ غلام ربانی ایم اے' ایل ایل بی

باب سوم - قرآن مجید کے مستند ہونے کا ناقابل تردید ثبوت (۲)

قرآن اور اس کی فصاحت

گو قرآن کی آیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یا تو مختصراً یا پھر مفصلاً" ۲۳ سال کے عرصہ تک اترتی رہیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک وجود کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ جو قرآن اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اس کا متن اور الفاظ وہی ہیں جو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے تھے۔ اس کے الفاظ' ان کی ترتیب اور اس کی مختلف سورتیں بھی اسی طرح ہیں جیسے انہیں خداوندی ہدایت کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا۔ قرآن کی ترتیب خدا کے منصوبے کا حصہ تھی اور خدا تعالیٰ نے اس کی خود ضمانت دی کہ وہ اپنی اصلی حالت میں محفوظ رہے گا اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ اس وحی کا ماخذ خود خدا تعالیٰ ہے:

"ہم نے خود یہ نصیحت اتاری ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" (۱۵:۹)۔

اس لئے جب بھی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی وحی کا نزول ہوتا وہ اسے اپنے متبعین کو بیان کر دیتے تھے اور وہ اسے تمام جماعت میں دہراتے تھے۔ چنانچہ جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی اسے کاتبان وحی کو اس وقت جو بھی مواد کتابت کا موجود ہوتا تھا اس پر لکھوا دیا جاتا تھا چاہے سفید پتھر' لکڑی کی تختی' کپڑے' چمڑے یا ہڈی کا ٹکڑا ہوتا اس پر لکھ دیا جاتا تھا۔ اس طرح سینکڑوں صحابہؓ تھے جنہوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا ہوا تھا اور وہ اسے دہرانے کے ماہر تھے اور انہیں علم تھا کہ قرآن پاک کی ترتیب میں کون سی آیت کس صورت میں کس جگہ ہے۔ مستند حدیث بیان کرتی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نازل شدہ قرآن پاک ہر سال جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ دہراتے تھے لیکن جس سال حضورؐ کا انتقال ہوا انہوں نے اس سال قرآن پاک کو پورے کا پورا دو مرتبہ سنایا اور دہرایا۔ موریس بکوئی کے الفاظ ہیں:

"قرآنی وحی کی اپنی ایک تاریخ ہے جو بالکل اوروں سے مختلف ہے اس وقت سے جب یہ پہلی مرتبہ انسان پر نازل کیا گیا اس کو حفظ کر لیا گیا اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی لکھ لیا گیا تھا۔ ہم اس لئے شکر گذار ہیں کہ اس نظام کے باعث قرآن پاک کے مستند ہونے کا کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوا۔"

(Maurice Baccaille: The Quran & Modern Science Markazi Maktaba Islam, New Delhi. 1982, p.18)

اس لئے قرآن پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں زبانی اور تحریری دونوں طرح ہی ایسی صورت میں محفوظ تھا جس کا علم سب کو تھا لیکن زبانی حقیقت کے برعکس جس میں یہ اسی ترتیب سے تھا جس طرح آج تک متعارف ہے تحریری طور پر یہ ایک منتشر حالت میں تھا۔ لیکن حضورؐ کی وفات کے فوراً بعد کسی کو بھی تحریری طور پر منتشر حالت کے بارے میں کوئی تشویش لاحق نہ ہوئی کیونکہ اس وقت بے شمار صحابہ حفاظ اس کے گواہ تھے۔ وہ خود قرآن پاک کی چلتی پھرتی اور زندہ مثالیں تھیں۔ لیکن جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانہ خلافت میں ارتداد کی جنگوں میں بہت زیادہ حافظ قرآن شہید ہو گئے تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ جمع قرآن کی زبانی روایت کو محفوظ کر لیا جائے اور تحریری طور پر منتشر ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دے دیا جائے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے یہ کام پیغمبر علیہ السلام کے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو جو خود بھی حافظ قرآن

تھے اور انہوں نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی قرآن پاک کی آخری دہرائی بھی سنی ہوئی تھی اور جن کی دانش' ثقاہت اور صلاحیت پر اعتماد کیا جاسکتا تھا کے سپرد کر دیا۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس تھا جب تک کہ وہ فوت ہوئے۔ اس کے بعد یہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے پاس رہا اور ان کی شہادت کے بعد ان کی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ کی تحویل میں رہا۔ یہ تھا وہ اصل نسخہ جس پر حضرت عثمانؓ خلیفہ سوم نے بیشتر نقول تیار کروائیں اور اسلامی ممالک کے بڑے بڑے شہری مراکز میں بھجوائیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ ہی ایڈیشن ہے جو زیر استعمال رہا ہے۔ اس طرح قرآن پاک اپنے اصل متن کی حالت میں خدا تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں مسلمانوں کے پاس محفوظ چلا آ رہا ہے۔ جس کو لاکھوں مسلمان صدیوں سے حفظ کر کے سینوں میں محفوظ کرتے آ رہے ہیں۔ حفظ قرآن کی روایت جس کا آغاز حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوا۔ آج تک قائم چلی آ رہی ہے اور قیامت تک اسی طرح چلی جائے گی اور اس طرح ہر ایسی کوشش کو ناکام بناتی چلی جائے گی جو قرآن پاک میں کسی تحریف کرنے کا کوئی ارادہ کرے۔ اس طرح نہ تو کوئی لفظ یا آیت قرآن پاک سے نکالی جاسکتی ہے اور نہ کوئی ڈالی جاسکتی ہے یا نہ ہی کوئی اس میں سے حذف کیا جاسکتا۔ اس لئے اس کو تباہ کرنے کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ "جھوٹ نہ اس پر اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے وہ حکمت والے تعریف کئے گئے اللہ کی طرف اتاری گئی ہے" (۴۲:۴۱)۔

قرآن پاک ایک زندہ معجزہ

بے شمار کوششیں کی گئی ہیں کہ قران پاک کو انسانی تخلیق و تصنیف ثابت کیا جائے اور یہاں یہ بات خارج از محل نہ ہوگی کہ مکہ کے الزامات کی گونج جو انہوں نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے تھے اسی طرح آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ قرآن پاک نے وہ الزامات بیان بھی کئے ہیں اور انہیں جھٹلایا اور مسترد بھی کیا ہے جن کے ذریعے نبیؐ کے مخالفوں نے ایک سعی لاحاصل کی تھی کہ کتاب کا الٰہی ماخذ ہونا ثابت نہ ہو سکے۔ ہرگاہ کہ بعضوں نے قرآن پاک کی تصنیف کو نبیؐ کا عمل قرار دیا ہے دوسروں نے اسے نعوذ باللہ مرگی اور دماغی بیماری کا کرشمہ سمجھانے کی کوشش کی ہے اور کچھ نے کہا کہ نعوذ باللہ نبیؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے قصص اور عقائد کو اپنی نبوت کا کاروبار چلانے کے لئے مربوط طریقے سے استعمال کرنے کی کاوش قرار دیا۔ اور حال یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہ تھے اور نہ ہی ان کی کوئی خاص تربیت الہیاتی مضامین کے حوالے سے یا کسی علم کی کسی شاخ میں ہوئی تھی پھر بھی قرآن پاک علم و دانش کا ایک ذخیرہ ہے۔ اسی طرح یہ قانون اور اخلاقی ہدایات کا دستور العمل اور زندگی کے مختلف انواع کے لئے مکمل ضابطہ ہے۔ قرآن پاک کا الہیاتی مصدر سے صادر ہونا تو ثابت ہے ہی اور یہ کہنا کہ رسولؐ نے اسے تصنیف کیا ہے خود رسولؐ کو الہاتی صفات سے متصف کرنا ہوگا۔

قرآن پاک پر استہزا کی کئی کوششوں میں سے ایک بہت مضبوط الزام مرگی کا مرض ہے۔ "کیا تمام انسانی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ اور بھی دکھایا جاسکتا ہے کہ جب ایک شخص مرگی کے دورے یا جنون یا کسی اور ذہنی بے قاعدگی کا مریض ہو اور اس نے اس طرح کی مربوط' عمیق' دانش اور معلومات سے بھری ہوئی کتاب لکھ دی ہو جن کو اس کے ہم عصر لوگوں کو علم بھی نہ ہوا ہو۔"

(Suzame Haneef: Islam & Muslims, Taj Company, New Delhi, 1986, p.31)

مکہ کے بے دینوں نے اپنی تمام ہمتیں قرآن پاک کو غیر معتبر قرار دینے پر صرف کر دیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور شعری آمد کی حماقت میں گرفتار ہوتے ہیں یا وہ کاہن ہیں یا ان پر کوئی بدروح مسلط ہے جو قرآنی آیات بیان کرتی ہے۔ قرآن ان تمام کافرانہ قیاسات کو حتمی طور پر جھٹلاتا ہے کہ نبیؐ نہ تو کوئی شاعر ہیں: "ہم نے نبی کو شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی یہ ان کے شایاں ہے۔ یہ تو صرف پیغام ہے اور قرآن ہے جو ہمیں باتوں کو واضح طور پر بیان کرتا ہے" (۶۹:۳۶)۔

قرآن تخیل کی پرواز کا بہاؤ نہیں اور نہ ہی یہ ایک شاعر کے وقتی جذبات کا عکس ہے۔ یہ تو ایک عملی ہدایت نامہ ہے جس میں کوئی غیر

متعلق اور مبہم بات بھی نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی فالتو کلام یا بے ربط باتیں ہیں۔ قرآن یہ بھی اصرار کرتا ہے کہ وہ کسی کاہن کا کلام نہیں (۶۹:۴۲)۔

کاہن تو محض مکر سے اندازہ کرتا ہے کہ مستقبل میں واقعات کیا شکل اختیار کریں گے۔ ان میں کوئی گہری روحانیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کی بیشتر پیشگوئیاں تو دھوکا دہی ہوتی ہیں لیکن قرآن پاک تو فہمائش اور تنبیہہ کے اسباق سے بھرا پڑا ہے اس لئے کہ یہ خدا کا کلام ہے' پیغام ہے جو ایک حضرت رسولؐ کے ذریعہ اتارا گیا ہے جس کے کردار کی صفات کوئی اوٹ پٹانگ قسم کی صفتیں نہیں ہیں جیسی کہ کاہنوں کی ہوتی ہیں۔

اس طرح قرآن پاک نے اس بات کو بھی جھٹلایا ہے کہ نبیؐ پر کوئی بدروح یا شیطان یا جن مسلط تھا اور فرماتا ہے کہ نبیؐ کی وحی کا ماخذ کوئی آسیب نہیں اور نہ ہی کوئی مافوق الفطرت قوت اس پر قابو پائے ہوئے ہے کیونکہ اس کے الفاظ دانش اور حکمت سے بھرے ہوئے ہیں جو اس کی طرف خدا سے وحی کئے جاتے ہیں۔

"تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں۔" (۸۱:۲۲)

"اور نہ ہی یہ کسی راندہ دھتکاری کوئی بدروح کا کلام ہے۔" (۸۱:۲۵)

"یقیناً یہ پیغام ہے اس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا مالک ہے"۔ (۲۶:۱۹۲' ۸۱:۲۷)

جہاں تک یہود و نصریٰ کے مواد کی چوری کا الزام ہے بہت سے قدیم اور جدید دانشوروں نے اسے جھٹلایا ہے اور اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ہرچند نبیؐ کے ابتدائی زمانہ میں یہودیوں اور عیسائیوں سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ تعلق بہت سرسری نوعیت کا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ان تعلقات کی وجہ سے ان دو مذاہب کے بارے میں محض سطحی علم بھی ممکن نہیں ہو سکتا ہے۔ عیسائیت پر عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت گڑبڑ قسم کا ہو گیا تھا۔ خود عرب میں اس وقت جو عیسائیت رائج تھی وہ بت پرستوں اور بے دینوں کے مذہب' اعمال اور عقائد سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی اور نہ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود کچھ بائبل سے اخذ کرنے کے قابل تھے۔ کیونکہ وہ خود بھی لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ مزید برآں بائبل اس زمانے میں عربی زبان میں دستیاب ہی نہ تھی یہ تو کوئی سو سال بعد میں عربی میں متعارف ہو سکی اور نہ ہی پیغمبرؐ یہودیوں کے افکار سے متاثر ہو سکتے تھے۔ کیونکہ مدینہ آنے سے پہلے یہودیوں کے انبیاء کے بارے میں یہ تفاصیل مکی سورتوں میں پیغمبر پر وحی کی جا چکی تھیں۔

یہ ناقابل یقین ہے کہ ایک شخص جو ناخواندہ تھا اور اسے قدیم الہامی نوشتوں کا کوئی علم بھی نہ تھا۔ خود ایک ایسی کتاب لکھ سکتا ہے جو اپنے متن میں اتنی شستہ اور ارفع ہو سکتی ہو اور یہ بھی غیر معقول بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو بدروحوں کی گرفت میں ہو یا مرگی کے دورے کا شکار ہو اپنے لئے ایسا ہدف مقرر کر سکتا ہو کہ دنیا سے تاریکی اور جہالت کو دور کرنے کی کوشش کرے--- بت پرستی اور توہمات کو مٹانے اور اپنے معاصر معاشرے میں روحانیت کی شمع روشن کرے۔ لیکن عجیب ہے کہ ایک شخص جو اپنے لوگوں میں غیر معمولی طور پر معزز' دیانت دار اور قابل اعتماد مشہور تھا۔ دفعتاً" اتنی جعلسازی کا مرتکب ہو کر اپنے آپ کو خدا کا رسول کہلانے لگے۔ ہم جو کچھ نبیؐ کے بارے میں جانتے ہیں یہ تمام الزامات نبیؐ اور اس کے پیغام کے مخالف اور متضاد ہیں اور ایسا ممکن ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن پاک کا الٰہی کلام اس عجیب مظاہرے سے بھی ثابت ہوتا ہے جو ہر دفعہ کی وحی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مستند روایات کی اساس پر کہا جا سکتا ہے کہ جب محمد رسول اللہؐ پر وحی کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو ان پر ناقابل بیان آثار ظاہر ہوتے تھے ان پر تھکن طاری ہو جاتی تھی اور گلے میں رکاوٹ ہونے لگتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ پر وحی اگر کسی نہایت ہی سرد رات یا دن میں نازل ہوتی تھی تو جب وحی کی کیفیت چلی جاتی تھی تو حضورؐ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے تھے (ابن خلدون' مقدمہ' ص ۷۰)۔ وحی کے بارے میں کوئی بات بھی اختیاری نہ تھی۔ یعنی نہ تو حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے نازل ہونے پر اس کی وصولیابی سے احتراز کر سکتے تھے اور نہ ہی وہ اس کیفیت کو اپنے آپؐ پر طاری کر سکتے تھے۔ کئی ایسے مواقع آئے جب

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنجیدہ خواہش تھی کہ وحی انہیں مستقبل کی راہنمائی کرے لیکن انہیں بعض مرتبہ مہینوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پھر ایکا ایکی وہ کیفیت برپا ہو جاتی تھی اور خود ہی دفعتاً" رفع بھی ہو جاتی تھی۔ اس کے رفع ہونے کے بعد حضورؐ اس کلام کو پڑھتے اور سناتے تھے جو اس دوران ان پر نازل ہوا ہوتا۔ یہ سچائی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو بھی نازل ہوتا تھا وہ خدا کا کلام ہوتا تھا' یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ جب انہوں نے اپنے اشتیاق میں نازل شدہ کلام کو جلدی جلدی دھرانا شروع کیا کہ وہ حفظ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سرزنش کی کہ وہ ایسا نہ کیا کریں بلکہ ہمہ تن محو ہو کر اسے پہلے سن لیں۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ وہ رسولؐ کی وحی کو ان کے حافظہ میں محفوظ کرنے کا انتظام کر دیں گے۔ یعنی رسولؐ کو ایسی قوت مل جائے گی کہ وہ نازل شدہ کلام کو حفظ بھی کر لیں گے۔

"اس کے ساتھ اپنی زبان کو مت ہلانا تاکہ اسے جلدی لے لے ہمارے ذمہ اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہے" (۷۵: ۱۶-۱۷)۔

قرآن پاک کے فصیح و بلیغ کلام کا ناقابل نقل سٹائل خود اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ قرآن پاک نبیؐ پر براہ راست اور لفظاً" نازل ہوا تھا۔

قرآن پاک کی ادبی فصاحت اس حقیقت سے بھی عیاں ہے کہ اس میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر و خطابت میں مشابہت نہیں ہے کیونکہ حضورؐ کا اپنا کلام بھی احادیث کے مجموعوں میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ ہرچند کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنی فصاحت میں مشہور تھے پھر بھی ان کی طرز خطابت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو قرآنی آیات کے ارفع اور عظیم سٹائل کا ہے۔ کیا یہ ایک انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ اس طرح دو مختلف سٹائل کو ایک دوسرے سے الگ الگ رکھنے پر قدرت رکھتا ہو۔

Harry Gay Lord Dorman کے الفاظ میں:

"قرآن لفظاً" لفظاً" خدا کا کلام ہے جو محمدؐ کو جبریل کے ذریعے فرمایا گیا۔ یہ دائمی معجزہ ہے جو اپنی اور محمدؐ کی گواہی دیتا ہے۔ اس کی اعجازی صفت تو اس کے طرز نگارش میں ہے۔ جو اپنی رفعت اور شوکت میں ایسا ہے کہ نہ تو انسان اور نہ ہی جن اس کے مماثل ایک سورت بھی بنا کر لا سکتے۔ چاہے وہ اس کی مختصر ترین سورت کے مقابل ہی ہو اور خواہ وہ اس کی تعلیمات' پیشگوئیوں اور مستقبل کے متعلق حیرت انگیز حد تک صحیح صحیح معلومات کا بیان ہو جو ناخواندہ محمدؐ اپنے طور پر اکٹھا کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

اس طرح قرآن کریم ایک زندہ اور دائمی معجزہ ہے جو خدا نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا جیسا کہ حضورؐ نے خود بھی فرمایا:

"ہر نبی کو معجزہ دیا گیا تھا کہ لوگ ان پر ایمان لائے لیکن جو مجھے دیا گیا ہے وہ خدا تعالیٰ کی وحی ہے جو میری طرف اللہ نے کی ہے۔ سو مجھے امید ہے کہ میرے متبعین تمام سابق انبیاء سے قیامت کے دن بہت زیادہ ہوں گے" (بخاری)۔

دوسرے نبیوں کے معجزات تو ان نبیوں کے زمانے تک ہی محدود تھے لیکن چونکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے تمام نوع انسانی کی طرف اور تمام زمانوں کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ ان کا معجزہ بھی دائمی طور پر زندہ اور موجود ہے۔ جب دوسرے نبیوں نے اپنے پیغامات منوانے کے لئے اپنے عطا کردہ معجزات کا مظاہرہ کیا تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں خود پیغام ہی کو معجزہ بنا دیا گیا۔ ایک ایسا معجزہ جو باقی انسانوں کی دسترس میں نہیں' اس کے باوجود کس قدر معقول اور منوانے والا ہے۔ خدا نے قرآن پاک کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک موثر دلیل بنا دیا۔ چنانچہ خدا نے چاہا کہ ایک ناخواندہ پیغمبر کا معجزہ انسانوں کے اسلام میں داخلہ اور ان کے ایمان کا شعور سچے یقین اور بدیہی ثبوت پر منحصر ہو۔

ایسا مذہب ہی جو ان بنیادوں پر اٹھایا گیا ہوا تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے موزوں اور قابل قبول ہو سکتا ہے چاہے ان کی کوئی نسل ہو یا کوئی زبان ہو۔

ایک اقتباس

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور لاہوری جماعت

(مسئلہ وحدۃ الوجود اور اقبال۔ مصنفہ ڈاکٹر الف' د' نسیم' شائع کردہ بزم اقبال' کلب روڈ' لاہور کے صفحات ۱۴۰ تا ۱۴۳ سے اقتباس ذیل میں قارئین کی خدمت میں پیش ہے)

"اس خط کا اقتباس ملاحظہ کریں جو منشی سراج الدین کے نام ہے۔ یہ ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کا تحریر کردہ ہے۔

"ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں' ان کو عربی اسلام اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے انشاء اللہ دوسرے حصہ میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے۔"

اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں کہتے ہیں:

"عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن تو پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابل اصلاح ہے۔ قنوطی لٹریچر کبھی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکا۔ قوم کی زندگی کے لئے اس کا اور اس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے۔"

ان خطوط میں علامہ اقبال تصوف کے اس لئے مخالف نظر آتے ہیں کہ یہ عجمی اثرات کا نتیجہ ہے اور بے عملی سکھاتا ہے لیکن ان کا یہ خیال حقائق پر مبنی نہ تھا یہ سب کچھ کرتا ان کے فلسفہ ایران و یورپ کے مطالعہ اور اس کے زیر اثر اس غلط سوچ کا کرشمہ تھا کہ مسلمانوں کے ہاں جو تصوف رائج ہے وہ بھی دوسرے مذاہب کے تصوف کی مانند ہے۔ جو خط آخر میں درج کیا گیا ہے اور جو اکبر الٰہ آبادی کے نام ہے اس میں عام تصوف اور اسلامی تصوف میں فرق کرتے ہوئے ان سے بے عملی اور عمل کی بدبو اور خوشبو سونگھ کر کسی حد تک تصوف کی طرف رجوع ضرور کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی پہلی حالت کافی دیر تک قائم رہتی ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان کی فکر کے پیچھے عہد جدید میں مسلمانوں کی گری ہوئی حالت کو ابھارنے کے سوا اور کوئی بات نہ تھی اور وہ اس جوش میں ہی وہ کچھ کہہ گئے ہیں جو انہیں نہیں کہنا چاہئے تھا اور جس پر بعد میں انہیں پچھتانا بھی پڑا۔ تحریک احمدیت کی بھی وہ اسی جوش میں حمایت کر گئے ہیں' وہ بھی ان کے عقائد کی نہیں بلکہ اشاعت اسلام کے لئے ان کے طریقہ کار کی اور صرف اس تحریک کی جس کا تعلق لاہوری جماعت سے ہے جو مرزا کو نبی نہیں مانتے۔ چودھری محمد احسن کے نام ۷ اپریل ۱۹۳۲ء کو ایک خط میں کہتے ہیں:

"مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو پہلے عبدالوہاب نجدی اور جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہو گا موخرالذکر ہی اصل میں موسس ہے زمانہ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا۔۔۔ باقی رہی تحریک احمدیت میرے نزدیک لاہور کی جماعت میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو میں غیرت مند مسلمان سمجھتا ہوں اور ان کی اشاعت اسلام کی مساعی میں ان کا ہمدرد ہوں۔ کسی جماعت میں شریک ہونا یا نہ ہونا انسان کی ذاتی اختیار اور طبیعت پر بہت کچھ انحصار رکھتا ہے۔ تحریک میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ آپ کو

خود کرنا چاہئے۔ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے کئی طریقے ہیں جن طریقوں پر اس وقت تک عمل ہوا ہے ان کے علاوہ اور طریقے بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے عقیدہ ناقص میں جو طریق مرزا صاحب نے اختیار کیا ہے وہ زمانہ حال کے طبائع کے لئے موزوں نہیں' ہاں اشاعت اسلام کا جوش جو ان کی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے قابل قدر ہے۔"

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ مرزائیت (لاہوری جماعت) اور وہابیت (عبدالوہاب نجدی کی جماعت) کی حمایت میں اقبال کا رجحان محض ان جماعتوں میں تحریک عمل کی بناء پر ہے ان کے عقائد کی بناء پر نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال میں احیائے اسلام کا اس دور میں ایسا سمندر جوش مار رہا تھا کہ جہاں بھی وہ اشاعت اسلام کی تحریک و ترویج کا عمل دیکھتے تھے اس کو پسند کرنے لگ جاتے تھے اور جہاں کہیں ایسی رکاوٹیں نظر آتی تھیں جن کی وجہ سے یہ کام رک سکتا تھا یا ست ہو سکتا تھا اس کی مخالفت پر اتر آتے تھے اس لئے وہ مسیحیت' مہدویت وغیرہ کے مسلمانوں میں رائج عقائد کے بھی خلاف تھے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ کبھی کوئی مسیح آئے گا تو انہیں نجات دلائے گا' کبھی کوئی مجدد آئے گا تو ان کی گلوخلاصی کرائے گا' کبھی کوئی مہدی آئے گا تو ان کی قسمت بدلے گا۔ اقبال کے نزدیک یہ انتظار مسلمانوں میں جمود کا سبب بنا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسی ہستی کے آنے کی امید میں بیٹھے ہیں جس کے آنے کا زمانہ نہ جانے کون سا ہے۔ کیا اس کے آنے کی امید میں مسلمان اغیار کی سختیاں سہتے رہیں اور ان کی غلامی خوشی سے برداشت کرتے رہیں؟ یہ تھا وہ مطمع نظر جس کے پیش نظر اقبال نے مسلمانوں کے اس قسم کے عقائد کی مخالفت کی۔ وہ خود مسیح کے دوبارہ آنے کی نفی تو نہیں کرتے البتہ ان کے آنے کی امید کے سہارے پر بے عمل ہو کر بیٹھ رہنے کو ضرور غلط قرار دیتے تھے۔ وہ مرزا غلام احمد کی مسیحیت کی نفی بھی اس لئے کرتے تھے کہ ان میں مسیح کی صلاحیتیں اور ارادے نہیں' جو شخص جہاد کو حرام قرار دیتا ہے وہ مسیح کیسے ہو سکتا ہے۔ مسیح اور مہدی کو تو احیائے اسلام کے لئے ایسا جہاد کرنا ہو گا جو پہلے تاریخ نے کبھی نہ دیکھا ہو گا۔ وہابیت (مذہب عبدالوہاب نجدی) کی حمایت بھی انہوں نے اسے ایک احیائے اسلام کی تحریک سمجھتے ہوئے کی تھی ورنہ عقائد عبدالوہاب کے وہ حامی نہ تھے۔ یہ بات ان کے مضامین کلام سے صاف ظاہر ہے۔"

(حقیقت معجزات حصہ اول مصنفہ ڈاکٹر قمر الزمان'

شائع کردہ سلسلہ دعوت قرآنی' ۲ ایک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور سے پیدائش مسیحؑ کے بارے میں اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے)

پیدائش مسیح

سیدنا مسیح کے معجزات پر بحث کرنے سے پہلے دو اساسی اصول جو اللہ نے اپنی سنت کے حوالے سے بیان فرمائے ہیں ان کا اعادہ کر لیا جائے۔ آپ نے قرآن کے حوالے سے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ کی سنت غیر متبدل ہے۔ خواہ وہ کائناتی حوالے سے ہو یا انسانی حوالے سے اور کیونکہ انسان کی تخلیق بھی اللہ کی ایک سنت ہے اس لئے اس سنت میں بھی تبدیلی نہیں۔

اختصار کے لئے صرف تین آیات ہی پیش خدمت ہیں۔

۱ لا تجد لسنتنا تحویلا (۰۰:۰۰)۔

۲ و لن تجد لسنہ اللہ تبدیلا (:)۔

۳ فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا ج و لن تجد لسنت اللہ تحویلا (:)۔

یعنی اللہ کی سنت کبھی بھی نہ ہی مکمل طور پر اور نہ ہی جزوی طور پر تغیر پذیر ہے اور نہ ہی نتائج کے مختلف ہونے کا امکان ہے اور کیونکہ انسان کی پیدائش کے تمام تر مراحل' یعنی نطفہ سے لے کر حمل اور وضع حمل کے تمام تر مراحل اللہ کے قوانین اور اللہ کی سنت ہیں اس لئے ان اصولوں میں بھی تغیر نہیں ہونا چاہئے۔

(۲) سیدنا مسیح کے حوالے سے دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام تر قصہ مسیح میں سیدنا مسیح کی الوہیت کا انکار ہے اور اس کے لئے قرآن نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ مخاطب کے خود اپنے مسلمات کو اسی کے خلاف حجت قائم کرنا ہے جس کو پچھلے صفحات میں بھی بیان کر دیا گیا ہے مثلاً ابن مریم کہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ مریم کا بیٹا ہے نہ کہ اللہ کا' پھر الوہیت میں کس طرح شریک ہوا۔ آیئے اب تمام تر سیرت مسیح یعنی سیدنا مسیحؑ کی پیدائش سے لے کر ان کی موت تک کے تمام مراحل سپر قران کے حوالے سے غور کریں گے۔

جیساکہ اوپر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ اپنی سنت کو صاف صریح الفاظ میں غیر متبدل کہتا ہے اور انسان کی تخلیق بھی اللہ کی ایک سنت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

الذی احسن کل شیئی خلقه و بدا خلق الانسان من طین ○ ثم جعل نسله من سللة من ماء مهین۔

اللہ وہ ہستی ہے جس نے جو چیز بنائی بہت خوب بنائی اور انسان کی تخلیق طین سے شروع کی پھر اس کی نسل کو ایک حقیر پانی کے سلالہ سے چلا دیا (السجدہ ۳۲:۸-۷)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ انسانی نسل کی افزائش ایک ماء مہین کے سلالہ سے ہوتی ہے یعنی ایک ستھرے ہوئے پانی کے ست سے چلتی ہے یہ اللہ کی انسانوں کی نسل چلانے کی سنت ہے جو انسان ہمیشہ سے دیکھتا چلا آ رہا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کسی بھی بچے کی پیدائش کے لئے ماں اور باپ کا ہونا کس قدر ضروری قرار دیتے ہیں سورۃ الانعام کی حسب ذیل آیت کریمہ سے اندازہ ہو جائے گا جہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ دلیل خود اپنے لئے پیش کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ارشاد ربانی۔

بلیع السموت والارض۔ انی یکون له ولد و لم تکن له

صاحبة و خلق کل شیی- و ھو بکل شئی علیم-

جو آسمانوں و زمین کا ابداع کرنے والا ہے اس کے بیٹا کیوں کر ہو سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اس نے تو ہر چیز پیدا کی ہے اور وہ ہر ہر چیز کا علم رکھتا ہے (الانعام ۶:۱۰۲)

ابداع کے معنی ہیں کسی چیز کا عدم سے وجود میں لانا یعنی کسی مادی چیز کے استعمال کئے بغیر ہی کائنات کو عدم سے وجود میں لانا اللہ کا کمال ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بیٹے کے نہ ہونے کی دلیل یہ دے رہے ہیں کہ کیونکہ ان کی بیوی نہیں اس لئے ان کے لئے بیٹے کا ہونا ناممکن ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بیٹا ہونے کے لئے ماں اور باپ کا ہونا کتنا ضروری ہے کہ اللہ پاک نے اپنے لئے بھی جو دلیل دینا پسند کی وہ اسی سنت کے حوالے سے دی یعنی اللہ نسل چلانے کے عمل کو میاں بیوی کے بغیر کرتے ہی نہیں ہیں اور یہ ان کا اٹل قانون ہے اور جو قانون وہ ایک دفعہ بنا دیتے ہیں اس کو وہ اپنے لئے بھی نہیں توڑتے۔

ما یبدل القول لدی و ما انا بظلام للعبید○

"میرے ہاں احکامات نہیں بدلے جاتے اس لئے کہ میں اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہوں" (ق ۵۰:۲۹)

یعنی اللہ نے جو ضابطہ ایک دفعہ مقرر کر دیا وہ ہمیشہ قائم رہتا ہے ان کے ہاں ایسا نہیں کہ آج قانون کچھ ہے اور کل قانون کچھ اور ہو جائے۔ آج قانون ہے کہ نسل مرد و عورت کی ذات سے چلے گی لیکن کل نسل انسانی کسی اور طریقے سے چلے۔ یا چند انسانوں کے لئے نسل انسانی کا طریقہ عورت و مرد کی ذات جبکہ دوسرے چند مخصوص لوگوں کے لئے صرف عورت یا صرف مرد ہی کافی ہو۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے وہ قصہ نقل کر دیا جائے جہاں سے ہمارے اسلاف نے یہ مفہوم لیا ہے کہ سیدنا مسیحؑ بن باپ پیدا ہوئے۔

سورۃ آل عمران میں سیدہ مریم کی ولادت اور ان کا ان کی والدہ کی طرف سے اللہ کے دین کے لئے نذر کرنا آیت نمبر ۳۹ میں بیان ہوا ہے اور اسی آیت کے آخری حصے میں سیدہ مریم کی والدہ اللہ سے سیدہ مریم اور ان کی اولاد کے لئے دعا مانگ رہی ہیں اس دعا میں ایک نکتہ غور طلب ہے کہ اس زمانے میں جو لڑکیاں اللہ کی نذر کی جاتی تھیں ان کی شادی ممنوع نہیں تھی ورنہ سیدہ مریم کی والدہ کیونکر سیدہ مریم کی اولاد کے لئے دعا مانگتیں۔

آیت نمبر ۳۷ میں نذر کی قبولیت کا تذکرہ ہے اور سیدہ مریم کی پرورش اور سیدنا زکریا کو سیدہ مریم کا کفیل بنانے کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔ و کفلھا زکریا۔ اور زکریا کو مریم کا کفیل بنایا۔ درمیانی آیات میں سیدہ مریم کی ہیکل کی زندگی مذکور ہے سیدنا زکریاؑ نے جب سیدہ مریم کو ایک صالحہ دوشیزہ کی صورت میں دیکھا تو ایک صالح بیٹے کی دعا کی اللہ پاک نے دعا قبول کی اور سیدنا یحییٰؑ کی بشارت دی جو سیدنا مسیحؑ کے ہم عمر تھے۔ آیت نمبر ۴۴ میں رسالت مابؐ کو بتایا گیا کہ یہ تمام خبریں ہیں جن کو آپؐ تک وحی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے کیونکہ آپ ان کے درمیان موجودہ نہیں تھے اور جو دیکھتے کہ وہ لوگ سیدہ مریم کی کفالت کی ذمہ داری لینے کے لئے اپنے اپنے قلم ڈال رہے تھے اور حالت یہ تھی کہ لڑائی جھگڑے پر اتر آئے تھے۔

یہ وہ آیت ہے جس میں سیدہ مریم کی کفالت ثانی کا ذکر ہے یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سیدنا یحییٰؑ کی پیدائش کے بعد ہی کفالت ثانی کا مسئلہ کھڑا ہوا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ کفالت ثانی کے وقت سیدہ مریم جوان تھیں۔ پہلی کفالت جو پیدائش کے بعد ہوئی وہ تو سیدنا زکریاؑ کے ذمہ تھی' اب جب سیدہ مریم جوان ہو گئی ہیں اور ہیکل کے مذہبی پیشوا سیدہ مریم کی کفالت کے لئے جھگڑے پر اتر آئے ہیں تو یہ کون سی کفالت ہے؟ یقیناً کسی بھی لڑکی کی زندگی میں دو ہی کفیل ہوتے ہیں ایک شادی سے پہلے اور دوسرا شادی کے بعد اس کا شوہر۔ پہلی کفالت کا ذکر تو آیت نمبر ۳۶ میں بیان کیا جا چکا جس کے تحت سیدنا زکریاؑ کو سیدہ مریم کا کفیل بنا دیا گیا اب یہاں کفالت کے

لئے جو جھگڑے ہو رہے تھے وہ ذرا سا غور کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کفالت ثانی کے جھگڑے تھے جو یقیناً شادی کے بعد کی کفالت ہے۔

اس آیت میں مذہبی پیشوائیت نے ڈنڈی ماری ہے اور قلم ڈالنے کو دریائے اردن میں پانی کے بہاؤ کے خلاف معجزانہ طور پر قلم کے تیرنے سے تعبیر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ جس کا قلم پانی کے بہاؤ کے خلاف سب سے زیادہ آگے گیا وہ کفیل بن گیا۔ حالانکہ قلم کے ذریعے جو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں لڑائی جھگڑے کا ذکر ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر علمی سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اور یہی اس وقت کی مذہبی پیشوائیت کا لڑائی جھگڑا تھا جس پر سیدہ مریم کو جب پریشانی لاحق ہوئی تو ان کو ایک کلمہ یعنی اللہ کے ایک فیصلے کی بشارت دی گئی اور اس کلمے یعنی اللہ کے فیصلے کا ظہور تھا المسیح عیسیٰ ابن مریم کی پیدائش جو دنیا و آخرت میں وجیہہ ہوں گے۔

اب غور کیجئے کہ جب ہیکل میں سیدہ مریم کے بارے میں لڑائی جھگڑے ہو رہے تھے کہ ان سے شادی کون کرے گا اور ایسے وقت میں سیدہ مریم کی تسکین کے لئے بشارت دی جائے کہ تم کو گھبرانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ تم کو تو ایک عظیم مقصد کے لئے چن لیا گیا ہے کہ تمہارے بطن سے ایک ایسے شخص کی ولادت ہو گی جو اس مذہبی پیشوائیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا تو سیدہ مریم کا ردعمل اس کے علاوہ اور کیا ہو گا کہ وہ فوراً تعجب کا اظہار کریں اور پوچھیں کہ میرے بیٹا کس طرح ہو گا جب کہ مجھے کسی شخص نے چھوا بھی نہیں ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں سے سیدنا مسیح کے بن باپ کی پیدائش کا عقیدہ قائم کیا گیا۔

ان آیات میں ایک لفظ کذلک آیا ہے۔

کذلک کے معنی کئے گئے "اسی حالت میں ہو گا" یعنی اللہ اسی حالت میں شوہر کے بغیر بیٹا پیدا کرے گا۔

حالانکہ یہی لفظ سیدنا زکریاؑ کے حوالے سے بھی آیا ہے جہاں وہ فرماتے ہیں کہ ان کی بیوی بانجھ ہے لیکن سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت نمبر ۹۰ میں سیدنا زکریاؑ کی بیوی کے لئے فرمایا گیا واصلحنا لہ زوجہ ہم نے اس کے لئے اس کی بیوی کو صحتمند بنا دیا"۔

یعنی کذلک کا معنی ہے کہ اب تک تو اسی طرح تھا لیکن آئندہ اس کی قانون الٰہی کے تحت تدبیر کی جائے گی اور جس طرح سیدنا زکریاؑ کے حوالے سے ان کی بیوی میں جو رکاوٹ تھی وہ دور کی گئی اسی طرح سیدہ مریم کے معاملے میں بھی یہی معنی ہیں کہ اب تک کا معاملہ تو ایسا ہی تھا لیکن آئندہ رکاوٹ کی تدبیر کی جائے گی۔ جس کی تفصیل سورۃ مریم میں دی گئی ہے (ص ص ۲۶ تا ۳۰)۔